جشنِ حماقت
کرشن چندر

جشنِ حماقت
طنزیہ۔ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ
442
برادرز

طابع : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
ناشر : محمد اطہر نقوی۔ علی برادرز (رجسٹرڈ)۔ لاہور
بار : اوّل ۱۹۸۴ء
تعداد : ایک ہزار
قیمت : پندرہ روپے
سرورق : سلیم اختر
کتابت : محمد صدیق بسرا

جشنِ حماقت

(طنز و مزاح)
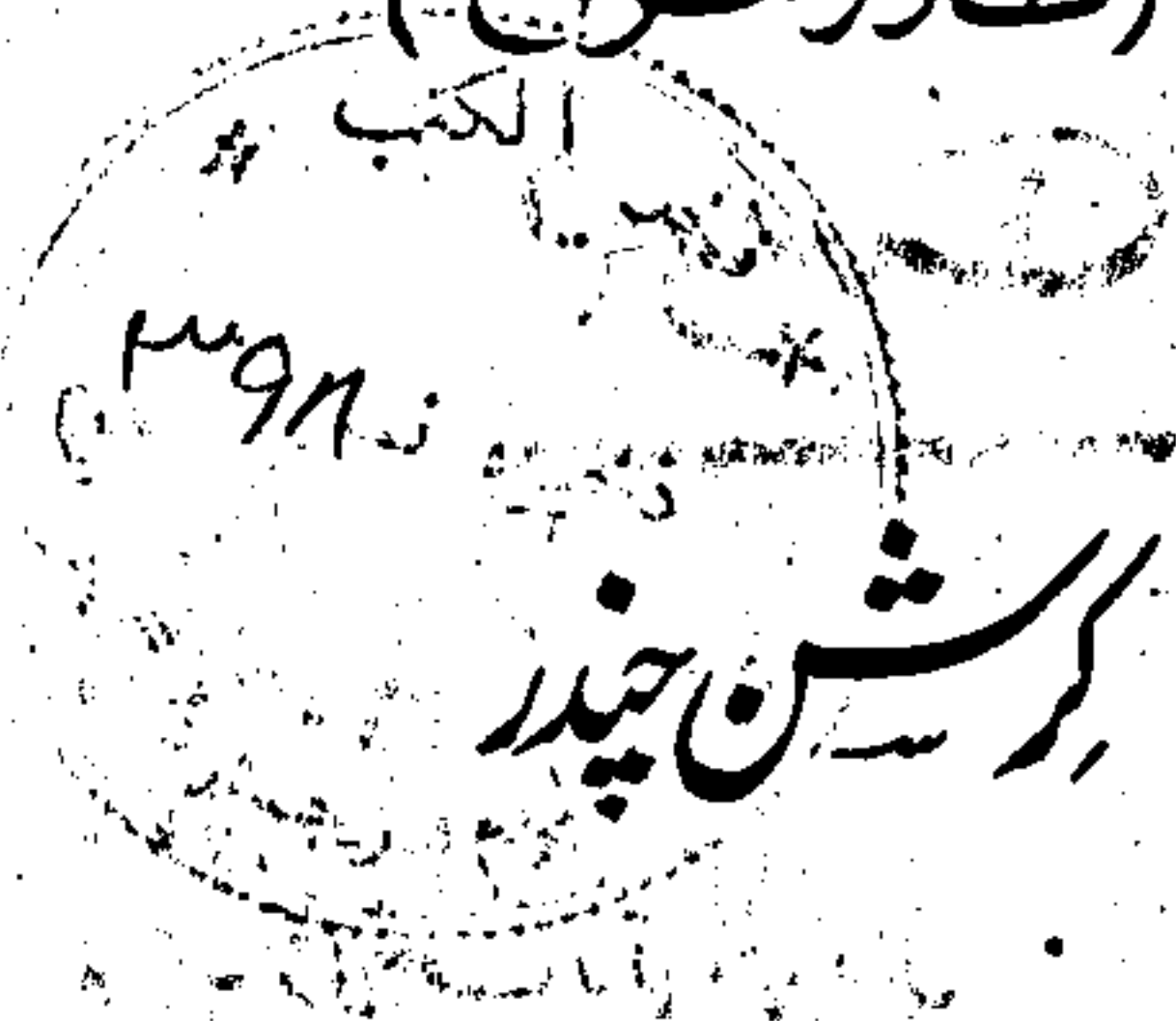
کرشن چندر

رجسٹرڈ
پبلشرز۔ بک سیلرز
۱۱۷- ذوالقرنین چیمبرز۔ اردو بازار۔ لاہور

فہرست

کرشن چندر ـــــ آدمی ہی آدمی

مجتبیٰ حسین

کرشن چندر کے بغیر اردو ادب پر سے ایک پورا سال بیت گیا، وقت بھلا کبھی رکتا ہے
کرشن جی کی وہ معصوم مسکراہٹ جو ان کی کہانیوں کی طرح انہی کا حصہ تھی پچھلے سال کہیں دکھائی
نہیں دی۔ ان کی پہلی برسی پر کتنی ہی یادیں ذہن میں تازہ ہو رہی ہیں۔ وہ اتنے بڑے ادیب
تھے لیکن عملی زندگی میں کسر نفسی اور انکساری کا پیکر تھے۔ ان کی انکساری میں ایک عجیب سا
شرمیلا پن تھا۔ ہر کام کرنے سے پہلے شرماتے تھے کوئی ان کی تعریف کرتا تو شرماتے تھے چھوٹوں
سے ملتے تو شرماتے تھے، بڑوں سے ملتے تو تب بھی شرماتے تھے۔

ان کے ایک ہاتھ پر انگریزی میں ان کا نام بڑے حروف میں گدا ہوا تھا CHANDER
KRISHAN میں نے ایک بار مذاق میں ان سے کہا تھا کرشن بھائی! یہ آپ نے
اپنے ہاتھوں کو وزٹنگ کارڈ کیوں بنا رکھا ہے! اور پھر یہ بتائیے کہ جب آپ کا ایک ہاتھ
مطبوعہ ہے تو دوسرے کو کیوں غیر مطبوعہ رکھا ہے اس پر بھی کچھ لکھیے بلکہ اردو میں لکھیے کیونکہ

آپ تو اردو کے ادیب ہیں۔ آپ کے ہاتھ پر اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہیئے۔" میری بات کو سن کر پہلے تو زوردار قہقہہ لگایا پھر گمبھیر ہو کر بولے " ہاتھ پر انگریزی میں نام لکھا ہو تو کیا ہوتا ہے۔ میرا ہاتھ تو اردو لکھتا ہے۔" اردو کے معاملے میں فوراً گمبھیر ہو جایا کرتے تھے۔

ان کے اس "دستی وزیٹنگ کارڈ" کی وجہ سے ایک زوردار لطیفہ بھی ہوا تھا۔ وہ جب دہلی آتے تو نظام الدین کے ہوٹل راج دوت میں ٹھہرتے۔ ایک رات میں اور کرشن چندر ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچے تو دیکھا کہ نئی نسل کے کچھ نوجوان کاؤنٹر پر کھڑے شراب نوشی میں مصروف ہیں نوجوان نشے میں دھت تھے کرشن جی کاؤنٹر پر پہنچے تو ایک نوجوان نے قدرے جھک کر ان کے ہاتھ پر گدا ہوا نام پڑھا اور پھر اپنے دو ساتھیوں سے سرگوشی کے انداز میں بولا۔ دوستو ایک کرشن چندر تو وہ ہے جس نے گدھے کی آتم کتھا رسرگزشت) لکھی ہے اور ہمارے درمیان ایک ایسا کرشن چندر آیا ہے جو اس "آتم کتھا" کا ہیرو ہے۔" نشہ میں سرگوشی بھی کافی بلند ہو جاتی ہے کرشن جی نے جیسے ہی یہ جملہ سنا بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ پیار سے اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ نوجوان کے اس جملے نے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی جی میں آئی کہ اس نوجوان کو اس بدتمیزی کا احساس دلایا جائے جب کرشن جی نے ہی دوسرا گال بھی ظالم کے آگے پیش کر دیا تو بھلا میں کیا کر سکتا تھا تاہم میں نے نوجوان سے کہا "برخوردار! تمہیں جس کرشن چندر کا انتظار ہے وہ ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ فی الحال تمہارے سامنے وہی کرشن چندر ہیں جنہوں نے گدھے کی آتم کتھا لکھی ہے۔" نوجوان نشے میں تو تھا ہی یہ سنتے ہی احساس ندامت کے بارے کرشن جی کے قدموں میں جھک گیا یہ دیکھ کر اس کے دوسرے ساتھی بھی کرشن جی کے قدم چھونے لگے ان کے منع کرنے کے باوجود یہ نوجوان نہ صرف ان کے پیر چھونے میں مصروف تھے بلکہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھی رواں

ہو گئے تھے اتنے میں ایک غیر متعلق شرابی وہاں سے گزرا تو وہ بھی بلا سوچے سمجھے کرشن جی کے قدموں میں جھک گیا جب چرن چھو چکا تو ایک ہچکی لے کر بولا "آخر معاملہ کیا ہے؟ ان کے چرن کیوں چھوئے جا رہے ہیں؟ کیا یہ کوئی مہاتما ہے۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں مہاتما ہیں سچ مچ مہاتما۔ تم کیا جانو یہ کیا ہیں؟" اس پر وہ پھر ایک بار کرشن جی کے چرنوں میں جھک گیا اور کرشن جی ان شرابیوں کی حرکتوں پر مسکراتے رہے وہ غصہ کرنا جانتے ہی نہ تھے نہ جانے ان کے پاس پیار کی اتنی ساری دولت کہاں سے آ گئی تھی ہر ایک کی جھولی اپنے پیار سے بھر دیتے تھے۔

کھانے کے وہ بڑے شوقین تھے۔ چٹپٹی چیزیں بڑے شوق سے کھاتے تھے ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ ان کے قلب پر پہلے حملے کے بعد ڈاکٹر نے انہیں مصالحہ دار اور چکنی چیزیں کھانے سے منع کر دیا تھا۔ سلمیٰ آپا (سلمیٰ صدیقی) ان پر کڑی نگرانی رکھتی تھیں کہ یہ کہیں کچھ کھا نہ لیں۔ ان دنوں وہ کھار کے "گرونواسس" والے مکان میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں چہل قدمی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں ان سے ملنے پہنچا تو سلمیٰ آپا سے اجازت لے کر میرے ساتھ چہل قدمی کے ارادے سے سڑک پر نکلے۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک آدھ فرلانگ کی چہل قدمی کے بعد واپس آئیں گے۔ اپنے گھر کے سامنے کی ساری سڑک عبور کی۔ دوسری سڑک پر مڑ کر ادھر ادھر دیکھا، اپنی جیب میں کچھ تلاش کیا۔ پھر مجھ سے بولے "تمہارے پاس ایک روپیہ ہے؟" میں نے کہا کرشن جی! بھلا ایک روپیہ کی کیا بات ہے" یہ سنتے ہی اپنی چہل قدمی کو تیز کر کے سڑک پر کھڑے ہوئے ایک ٹھیلے کے پاس پہنچے جہاں گرم گرم پکوڑے تل کر بیچے جا رہے تھے اور انہوں نے مشین کی سی تیزی کے ساتھ پکوڑے کھانے شروع کر دیئے اس وقت ان کے چہرے پر عجیب و غریب معصومیت کھیل رہی تھی میں نے ایسی معصومیت

کسی بڑے ادیب کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی۔ جب کھا چکے تو مجھ سے کہا، "تم بھی کھانا چاہو تو کھا لینا بہت اچھے بنے ہیں۔" مجھے ان کی سادگی پر ہنسی آ گئی واپسی پر بولے، "خبردار سلمیٰ کو نہیں بتانا یہ عورتیں تو یونہی پریشان رہتی ہیں اور ہاں بمبئی میں کتنے دن ٹھہرو گے؟ جب تک رہو شام میں چہل قدمی کے لئے یہاں چلے آنا۔"

مہمان نوازی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ کوئی ملنے جاتا تو ان کے سامنے پھلوں کی پلیٹ رکھ کر خود پھلوں کو کاٹنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ سیب ایسی نفاست سے کاٹتے تھے کہ ایک جگہ چاقو لگا دیتے تو سارے چھلکے کو بیک جنبش قلم اتار دیتے تھے ان کو سیب کاٹتے دیکھنا بھی ایک انوکھی مسرت تھی۔ وہ ایک سیب کاٹ لیتے تو جی کہنے کو چاہتا تھا، سبحان اللہ۔ مرحبا مکرر ارشاد ہو۔ کیا فصاحت ہے! کیا بلاغت ہے۔

طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے کرشن جی کا رتبہ بہت بلند تھا اس لئے زندگی میں کہیں بھی کوئی مزاحیہ صورت حال دکھائی دیتی تو اس میں وہ بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۶ء میں جب وہ مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس کی صدارت کرنے کے لئے حیدرآباد آئے تو ہم لوگوں نے عملی مذاق کے طور پر سوچا کہ انہیں حیدرآباد کے مشہور مزاح کار حمایت اللہ کی "مزاحیہ موٹر" میں بٹھایا جائے اس پچاس سال پرانی موٹر کی خوبی یہ تھی کہ اس کی کوئی چھت نہیں تھی۔ البتہ پہیے تھے۔ سیٹیں بھی کہیں تھیں اور کہیں نہیں تھیں۔ اس موٹر کو بیک وقت تین چار ڈرائیور مل کر چلاتے تھے ایک کے ہاتھ میں بریک ہوتا۔ دوسرے کے ہاتھ میں اسٹیرنگ وہیل تیسرے کے پاؤں میں ایکسیلریٹر اور چوتھے کے ہاتھ میں ہارن۔ میں نے کرشن جی سے کہا، "کرشن جی ہم ایشیا کے عظیم افسانہ نگار کو ایشیا کی سب سے گھٹیا موٹر میں بٹھا کر جلسہ گاہ میں پہنچانا چاہتے ہیں۔" ہنس کر بولے، "اس موٹر کے وسیلے سے اگر تم لوگ مجھے ایشیا کا

عظیم افسانہ نگار ماننا چاہتے ہیں تو چلو یہ خطرہ بھی مول لیتے ہیں" کرشن جی، سلمیٰ صدیقی اور یوسف ناظم اس موٹر میں بیٹھ گئے۔ باقی جتنے لوگ تھے وہ سب کے سب ڈرائیور بن گئے۔ کوئی ڈپٹی ڈرائیور تھا کوئی اسسٹنٹ ڈرائیور اور ایک تو بھاجک" بھی تھا کرشن جی اس موٹر میں بیٹھ کر اتنے خوش ہوئے کہ کتنی دیر تک ان کے چہرے پر یہ خوشی دمکتی رہی

کرشن جی آخری زمانہ میں دہلی آنے سے بہت گھبرانے لگے تھے کہتے تھے ایک بار آیا تو بھابجہ ایک حادثے میں چل بسے، دوسری بار آیا تو مہندر ناتھ گزر گئے۔ تیسری بار آیا تو سرلا دیوی چلی گئیں۔ آخری مرتبہ وہ جولائی ۱۹۷۶ء میں ایک ہفتہ کے لیے دہلی آئے تھے یوں تو روز ہی ملتے تھے لیکن ۶ جولائی کو دوپہر میں مجھ سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آج تم میری طرف سے اپنے دوستوں کو "راج دوت" پر رات کے کھانے پر بلاؤ"۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نکر تونسوی، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان کے پاس پہنچے ان کے چھوٹے بھائی ادم بھی تھے۔ بس یہی ان سے آخری ملاقات تھی۔ قلب پر دو شدید حملوں کے باوجود وہ زندگی سے سرشار تھے۔ ان کا ارادہ ایک انگریزی رسالہ نکالنے کا تھا۔ کہتے تھے میں تم لوگوں کی چیزیں انگریزی میں چھاپوں گا۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں ان کے قلب پر جو تھا حملہ ہوا اس سے ایک ہفتہ پہلے ان کا ایک خط ملا۔ قلب پر پے بہ پے حملوں کے باوجود زندگی سے مایوس نہیں ہوئے تھے ان میں جینے کا کتنا حوصلہ تھا ہم نے ایسے بھی روپ دیکھے ہیں جنہیں چھینک بھی آتی ہے تو وصیت نامے لکھنے کو دوڑتے ہیں۔ احباب کو جمع کرتے ہیں۔ بیویوں کی چوڑیوں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے خود اپنے تعزیتی جلسوں کا خاکہ تیار کرواتے ہیں۔ کرشن جی نے آخری سانس تک اپنے پرانے دوستوں سے کبھی موت کی بات نہیں کی۔ انہیں اپنی موت کی بات کرنے کی ضرورت

بھی نہیں تھی کیونکہ کرشن جی نے اپنے قلم کے ذریعہ سدا زندہ رہنے کا اہتمام کرلیا تھا۔ وہ کرشن چندر جو ہمارا شعور ہے ہمارا ذہن ہے اور کرشن چندر کا وہ بانکپن جو ہندوستانی ادب کا حصہ بن چکا ہے بھلا کہیں مر سکتا ہے۔

کرشن جی نہ صرف آنے والے برسوں بلکہ آنے والی صدیوں میں بھی زندہ رہیں گے وہ اب ہمارے ادب کے افق پر ایک قوس قزح کی طرح تن گئے ہیں اور اس قوس قزح کے نیچے سے ادب کے کارواں گزرتے رہیں گے۔

ماہر نفسیات

آجکل سنتے ہیں امریکہ نے علم نفسیات کے ماہروں نے انسانی علم کے خزینوں میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ دنیا میں انسانی امراض کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ محض انسانی دماغ کا وہم ہے۔ یعنی اگر آپ کو کوڑھ ہے تو دراصل یہ کوڑھ نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے دماغ کا وہم ہے کہ آپ کو کوڑھ ہے۔ اگر آپ کو لقوہ کی شکایت ہے تو یہ شکایت دراصل آپ کے دماغ کے غلط سوچنے کا نتیجہ ہے اور جس دن آپ کے دماغ سے یہ بات نکل گئی آپ کو کوڑھ یا لقوہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ہر مرض کو دماغ کی کسی جنونی کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ ماہر نفسیات اکثر کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مریض کے دماغ کو ان مجنونانہ کیفیت سے خالی کرا لیا جائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم مریض کی جیبوں کو ضرور خالی کرا لیا جائے کہ اس کے بغیر کسی علم وفن کی تکمیل ناممکن ہے۔

مشہور امریکی ماہر نفسیات ڈاکٹر میگ گراگری کا کہنا ہے کہ انسان کے امراض ہی نہیں اس کے حسیات و جذبات اور فکری رجحانات بھی اسی قسم کے دماغی توہمات کا شکار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آپ غریبوں سے محبت کرتے ہیں تو دراصل یہ آپ کا وہم ہے آپ ان سے دراصل نفرت کرتے ہیں اور اس نفرت کو محبت کے پردے میں چھپا کر اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ نفرت محبت کی حس معکوس ہے۔ اگر آپ ہڑتال کر رہے ہیں تو بات دراصل یہ ہے کہ یہ آپ کا وہم ہے کہ آپ ہڑتال کرنی چاہتے ہیں۔ آپ ہڑتال اس لئے کر رہے ہیں کہ شعور کی تہوں میں کہیں یہ خیال آپ کے اندر چھپا ہوا ہے کہ آپ کیوں کام کریں آپ کیوں آرام سے نہ بیٹھ کر روٹی کھائیں اور دوسروں کو اپنا کام کرنے دیں۔ یعنی آپ ہڑتال اس لئے کرتے ہیں کہ آپ کے اندر سرمایہ پرست ذہنیت کام کر رہی ہے گویا اس طرح سے جو مزدور ہوتا ہے وہ اندر سے سرمایہ دار ہوتے ہیں اور جو سرمایہ دار ہوتا ہے وہ دراصل مزدور ہوتا ہے اور اگر اس کا آگے اور تجزیہ کیا جائے تو نہ کوئی سرمایہ دار ہے نہ کوئی مزدور ہے۔ یہ سب آپ کا وہم اور دماغی فتور ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل امریکہ میں پاگلوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ جوں جوں امریکی ماہر نفسیات کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انسانی شعور کے اندر نت نئی مجنونانہ کیفیات کا پتہ چلتا جاتا ہے۔ ایک روز امریکی ماہر نفسیات اس بات کا پتہ بھی چلا لیں گے کہ انسانی جنون کے سوا کچھ بھی نہیں اور یہ ایٹم بم کے بعد دوسری دریافت ہوگی۔ جس سے امریکی طرز معاشرت کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔

ڈاکٹر میگ گراگری نے اس تھیوری کی بنا پر انسانی محبت کو جنون کی ایک کیفیت قرار دیا ہے۔ انہوں نے ایک سفوف بھی ایجاد کیا ہے جسے پانی میں گھول کر پیتے ہی انسان کے دل سے محبت کافور ہو جاتی ہے۔ پنسلین کے بعد دوسری بڑی دریافت ہے۔ جو

امریکی طب نے ایجاد کی ہے۔ سنا ہے کہ یہ سفوف ساری امریکی آبادی کو کھلایا جائے گا اور امریکی گورنمنٹ کے صدر ٹرومین اس میں بذات خود بڑی دلچسپی لے رہے ہیں بلکہ سب سے پہلے یہ سفوف خود انہوں نے اور مسٹر مارشل نے چکھا تھا۔ اس کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے ہیں۔ اس لئے اب پوری امریکی آبادی پر اس کا تجربہ کیا جا رہا ہے تاکہ دوسرے خطرناک امراض کی طرح انسانی محبت کی روک تھام بھی کی جا سکے۔ چھوٹی عمر کے امریکی بچوں کے لئے اس سفوف سے ایک ٹیکہ تیار کیا گیا ہے۔ جو ان کے پیدا ہوتے ہی لگا دیا جائے گا اور چیچک کے ٹیکہ سے بھی پہلے لگا دیا جائے گا۔ کیونکہ امریکی ڈاکٹر کا خیال ہے کہ یہ مرض کوڑھ، تپ دق اور سرطان سے بھی زیادہ مہلک ہے اور اگر کہیں اس مرض نے امریکہ میں وبا کی صورت اختیار کر لی تو اس کا اثر پوری امریکی زندگی، اس کی معاشرت سیاست اور معیشت پر بھی پڑے گا۔ وال سٹریٹ کے بینکروں نے پچاس ارب ڈالر کی رقم سے ایک کارخانہ قائم کیا ہے جہاں اس سفوف کو تیار کیا جائے گا۔ اور ایک تجویز یہ بھی ہے کہ صرف امریکی عوام کا ہی بھلا کیوں ہو۔ دنیا بھر کے لوگ اس سفوف سے محروم کیوں رکھے جائیں چنانچہ یہی سوچ کر امریکی نمائندے نے یو۔ این۔ او میں ایک تجویز کو رکھا کہ دنیا بھر کے عوام کو یہ سفوف چٹا لیا جائے۔ لیکن حسب عادت روسی نمائندے نے اپنے ویٹو سے کام لے کر اس تجویز کو رد کر دیا۔ یو۔ این۔ او کی اکثریت جس میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ اس تجویز کے حق میں تھی۔ صرف ایک ایسی بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ روس کس طرح جمہوریت کا دشمن ہے اور اپنے ویٹو کو انسانی بہبود کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہاں اپنے مضمون کو صرف سائنسی معلومات تک محدود

رکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ سمجھتا ہوں کہ سائنس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ میں علم طب کی بات کر رہا ہوں۔ اس سے مجھے مشہور امریکی جراح مسٹر قل۔ قل ڈوبٹیل کی حیرت انگیز جراحی کا خیال آیا ہے۔ امریکن فن جراحی نے قل۔ قل ڈوبٹیل اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے بہت ترقی کی ہے ایک شخص کی انتڑیاں نکال کر دوسری انتڑیاں ڈال دی گئیں۔ ایک آدمی ایسا ہے جس کا معدہ نکال دیا گیا ہے اور وہ صرف آنتڑیوں میں جانے والی غذا کے سہارے جی رہا ہے۔ ایک آدمی کے دل کا غلیظ حصہ نکال کے پھینک دیا گیا اور اس کی شہ رگ کو تبدیل کر دیا گیا اور ایک آدمی کا پھیپھڑا کاٹ کے وہاں لوہے کی نلکی لگا دی گئی ہے۔ جو خود سانس اندر کھینچتی ہے اور باہر نکالتی ہے اور انسانی پھیپھڑے کی طرح مختلف گیسیں پیدا کر کے خون کو صاف کرتی ہے اور تنفس کو جاری رکھتی ہے۔

امریکن فن جراحی کے کمالات کیا بیان کروں۔ یہ ڈاکٹر لوگ آپ کے بدصورت کان کاٹ کے آپ کو نئے کان عطا کر سکتے ہیں۔ نئی ناک دے سکتے ہیں۔ نئے ہونٹ بنا دیتے ہیں۔ آپ کے سر پہ بال اُگا دیتے ہیں یہ لوگ ایسا کر سکتے ہیں کہ آپ آنکھوں سے سُن سکیں۔ کانوں سے دیکھ سکیں۔ ناک سے چھو سکیں اور زبان سے سونگھ سکیں۔ ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز معجزہ جان حبشی کے سلسلے میں ہوا ہے۔ جان حبشی کا رنگ کالا تھا۔ ڈاکٹروں نے انجکشن کے ذریعے سے اس کے رنگ کو گورا کر دیا۔ اس کے موٹے ہونٹ پتلے کر دیئے۔ اس کے گنگھریلے سیاہ بالوں کو سیدھے سادھے سنہری بالوں میں تبدیل کر دیا اور اس کے آگے بڑھے ہوئے جبڑے کو اس طرح گھما دیا کہ اب اس کا چہرہ بالکل یورپی معلوم ہوتا ہے۔

یہ سب کچھ تو ہوا۔ حبشی کا رنگ گورا ہو گیا۔ لیکن اس کی پتلون پھٹی ہوئی ہے۔ اس کی ناک پہلے سے کہیں خوبصورت ہو گئی ہے۔ لیکن اس پاؤں میں جوتا نہیں ہے۔ اس کا جبڑا گھوم کر ٹھیک بیٹھ گیا ہے۔ لیکن اس جبڑے کے اندر گندم کا ایک دانہ نہیں گیا ہے۔ امریکی ڈاکٹروں نے دل کا ایک غلیظ حصّہ تو کاٹ کے پھینک دیا ہے۔ لیکن وہ دل کی غلاظت کو نہیں نکال سکے۔ انہوں نے شہ رگ کو تبدیل کر دیا ہے۔ لیکن اس کے اندر نیا خون نہیں نکال سکے۔ انہوں نے ایک لوہے کا پھیپھڑا تو ایجاد کر لیا۔ لیکن سماج کے تنفس کو ٹھیک نہیں کر سکے۔ انہوں نے ایک آدمی کے جسم کو تبدیل کرنے میں اتنی ساری کاوشیں صرف کر دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم کی روح سکڑ کر رہ گئی۔ وہ ایک ایٹم بم کو توڑ دینے کی فکر میں ہیں۔ دو ایٹموں کو ملا کر ایک نئی بہتر طاقت کو وجود میں لانے کے خلاف ہیں مگر میں پھر سیاست میں بہک چلا۔ بھلا سیاست اور سائنس کا آپس میں کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک مجذوب کی بڑ ہے۔ شاید مجھے بھی ایک ماہر نفسیات کی ضرورت پڑے گی۔

سُنتے ہیں کہ اب امریکی ماہرین نفسیات نے فیصلہ کیا ہے کہ تمام تکلیفوں کا واحد منبع انسان کا دماغ ہے۔ یہ دماغ سوچتا ہے۔ حرکت کرتا ہے کام کرتا ہے اور اسی سے تمام الجھنیں زندگی میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ آج کل وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر انسانی کھوپڑی سے دماغ کو نکال کر اس میں بھوسہ بھر دیا جائے تو کیسا رہے؟ مگر سُنا ہے کہ روس پھر اس کی مخالفت کرے گا۔

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال،، اسمٰعیل میرٹھی نے کہا ہے۔ مگر یہ قصہ پرانے زمانے کا ہے جب لڑکیاں واقعی دال بگھاتی تھیں۔ آج کل تو وہ صرف شیخی بگھارتی ہیں۔
کہتے ہیں پرانے زمانے میں دال اتنی سستی ہوتی تھی کہ نہ صرف کھائی جاتی تھی بلکہ جوتیوں میں بھی بٹتی تھی۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ اس زمانے میں دلّی کے گلی کوچوں کے باہر سرِ شام گداگر ہاتھوں میں سلیم شاہی جوتیاں لئے کھڑے رہتے تھے اور آوازیں لگاتے تھے دال بٹوا لو۔ جوتیوں میں دال بٹوا لو۔ آج کل سلیم شاہی جوتے کون پہنتا ہے۔ اس لئے دال چپلوں میں بٹتی ہے اور بڑی مشکل سے ملتی ہے۔
دال بگھارنے کا فن بھی اصلی گھی کے ساتھ عنقا ہو گیا اپنے بچپن کا زمانہ یاد کیجئے جب اصلی دال پر کڑکڑاتے ہوئے اصلی گھی میں لہسن یا پیاز کا بگھار دیا جاتا تھا جس کی خوشبو اپنے محلہ سوئی والان سے ہمسائے کے دالان تک پھیل جاتی تھی۔ شاید کچھ اور مصالحے بھی پڑتے ہوں گے کیوں کہ بزرگوں سے سُنا ہے کہ واجد علی شاہ کے زمانے میں شرفو نام کا ایک باورچی

شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باورچی تھا۔ پوچھا گیا۔ کیا پکاتے ہو بولا "صرف دال پکاتا ہوں اور ایک کٹوری دال کے لئے ایک سواشرفی لیتا ہوں"

واجد علی شاہ بولے "میاں دال۔ آخر تو دال ہی ہے۔ ایک کٹوری دال کے ایک سواشرفی کیا معنی؟"

عرض کیا "جہاں پناہ۔ دالیں تو سب ہی ایک سی ہوتی ہیں۔ کیا مونگ، کیا مسور، اصل چیز تو بگھار ہے۔ اس کے ایک سواشرفی لیتا ہوں" شرفو کو ٹرائیل پہ رکھ لیا گیا۔ رات کو جب بارہ دری میں دستر خوان بچھا تو شاہ کے لئے ایک کٹوری دال بھی موجود تھی۔ واجد علی شاہ نے دال چکھی۔ فرمایا "مزے میں خوب ہے لذیذ اور عمدہ ہے۔ مگر اس ایک کٹوری ڈال کے لئے ایک سواشرفی؟ کچھ سمجھ میں آیا"

شاہ نے دال کے دو تین لقمے چکھ کے کٹوری الگ رکھ دی۔ شرفو نے آہستہ سے وہ کٹوری شاہی دستر خوان سے کھسکا لی اور اسے بارہ دری کے قریب ایک روش کے کنارے انار کے ایک سوکھے پیڑ پہ ڈال کر چلا گیا۔

صبح جب واجد علی شاہ چمن کی سیر کو نکلے تو دیکھا کہ روش کے کنارے سے انار کا سوکھا ہوا پیڑ ہرا ہو چکا ہے۔ فوراً شرفو کو طلب کیا مگر شرفو رات ہی سے غائب ہو چکا تھا۔ پھر کبھی نہیں نظر آیا۔

اللہ اللہ ایک وہ دال پکانے والے باورچی تھے اور ایک ہمارے دوست خواجہ احمد عباس ہیں کہ ادیب، فلم ساز اور صحافی ہونے کے علاوہ باورچی ہونے کا بھی دم بھرتے ہیں اور ایسی عمدہ دال پکاتے ہیں۔ ایسی عمدہ دال پکاتے ہیں کہ ہرے بھرے پیڑ پہ ڈال دو پانچ منٹ میں سوکھ کر ٹھنٹھ ہو جائے گا۔

دال کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ حیدر آبادی دال۔ کہ مزے میں نرگش بلکہ طنز آمیز معلوم ہوتی ہے۔ مخصوص بگھار کے ساتھ اعلیٰ قسم کے چاول کے ساتھ کھائیے طبیعت مفرح ہو جاتی ہے اور جی بے اختیار کسی کی ٹانگ کھینچنے کو چاہنے لگتا ہے۔ حیدر آباد میں مزاح نگاروں کی کثرت کی وجہ یہی کھٹی دال ہے۔ میں خود جب اپنے ذہن میں مزاح کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ فوراً چند دن کے لئے حیدر آباد کا رخ کرتا ہوں۔ البتہ حیدر آبادی مزاح نگاروں کے لئے سال میں حیدر آباد کے چار چکر لگانا ضروری ہیں۔ ورنہ یوں ہو کہ یوسف ناظم صاحب کی طرح سنجیدہ شاعری پر اتر آتے ہیں۔

یوپی کی دال۔ بالعموم ارہر کی ہوتی ہے۔ اور اگر ارہر کی نہ ملے تو جو دوسری دال ملے گی وہ بھی ارہر ہی کی ہوگی۔ ارہر کے کھیت کو یوپی کے کلچر میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو سیب کے پیڑ کو کشمیر میں یا ناریل کے پیڑ کو کیرالا میں۔ ارہر کی دال میں ایک ہلکی سی بساندھ ہوتی ہے اور کہیں پہ ایک ہلکی سی تلخی بھی۔ مجھے ارہر کی دال بالکل پسند نہیں مگر راہی معصوم رضا کو بہت پسند ہے۔ آپ انہیں دعوت پہ بلانے کے لئے مرغ و ماہی کا ذکر کریں کباب اور قورمے کا لالچ دیں۔ انکار کر دیں گے۔ ہاں ارہر کی دال کا ذکر کیجئے تو آپ کی دعوت میں بلا تکلف بلکہ بن بلائے بھی چلے آئیں گے۔ کچھ دوستوں کے خیال میں میرے اور راہی کے درمیان بنا نزاع اردو ہندی کا جھگڑا ہے۔ جی نہیں۔ صرف ارہر کی دال!

ارہر کی دال میں اور کوئی خوبی ہو نہ ہو۔ یہ خوبی تو ضرور ہے کہ اسے کھاتے ہی گونگے سے گونگا آدمی بھی بے تکان بولنے لگتا ہے اور مطالب اور معانی سے بے نیاز بولتا ہی چلا جاتا ہے۔ پورے یو۔ پی میں یہی دال کھائی جاتی ہے۔

سانبھر کی دال۔ جو لوگ سانبھر کا تسکار کر چکے ہیں۔ کہیں مغالطے میں نہ رہیں۔ اس

میں گوشت بالکل نہیں پڑتا۔ یہ جنوبی ہند کی مرغوب ترین دال ہے۔ معلوم نہیں کس دال سے پکاتے ہیں۔ کیونکہ اس میں دال نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ البتہ لوکی بیگن، پیاز اور کدو کے ٹکڑے ضرور ہوتے ہیں۔ اسے بالعموم اڈلی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ اسے کھاتے ہی ذہن کلکتہ کی طرف مائل ہوتا ہے زیادہ کھاؤ تو بھارت ناٹیم کی طرح تھرکنے لگتا ہے۔

گجراتی دال کچھ ایسی کھانے کے لئے ہوتی ہیں۔ گجراتی دال پینے کے لئے ہوتی ہے۔ اس میں گڑ بھی ڈالتے ہیں اور نمک بھی اور دودھ بھی اوپر سے غالباً ارنڈی کے تیل کا بگھار دیتے ہیں اور پیاز اور لہسن سے دور رکھتے ہیں۔ پہلی بار جب اس دال کی کٹوری میرے سامنے آئی تو میں نے آہستہ سے چمچہ چلا کر ٹٹولا کچھ پتہ نہ چلا کون سی دال ہے۔ پھر انگلی پھیر کر معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ ناچار عینک پہن کر کٹوری میں آنہ گیا۔ گھنٹہ بھر کی شناوری کے بعد پیندے میں دال کا ایک دانہ مل گیا۔ معلوم ہوا اس دال میں دانہ کم ہوتا ہے۔ پانی زیادہ۔ آب و دانہ کی ترکیب غالباً اسی گجراتی دال نے سجھائی ہے۔ پھر وہ جملہ بھی یاد آیا" دانے دانے پر لکھا ہے کھانے کا نام"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گجراتی دال کی ہر کٹوری میں پتیلے شوربے کے ساتھ دال کا ایک دانہ ڈال دیا جاتا ہے اور ڈالنے سے پہلے اس پر مہمان کا نام بھی چھاپ دیا جاتا ہے یا چپکا دیا ہے۔ بس پر میں نے صبر کیا اور کٹوری اٹھا کہ دال کا سارا پانی پی لیا اور یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ اپنے حصے میں یہی دانہ پانی مقسوم تھا۔

کسی نہ کسی شکل میں یہی دال گجرات کے علاوہ مہاراشٹر۔ راجستھان، یوپی، بہار، اڑیسہ اور کرناٹک میں بھی رائج ہے۔ ہم ہندوستانی نہ صرف یہ کہ خود یہی دال کھاتے ہیں۔ بلکہ اپنے کھلاڑیوں کو بھی یہی دال کھلاتے ہیں۔ اور اس کے بعد متعجب ہوتے ہیں کہ ہمارے کھلاڑی اولمپک گولڈ میڈل کیوں نہیں حاصل کرتے؟ کرکٹ کے ٹسٹ میچ کیوں نہیں جیت سکتے ہاکی کے میدان

سے فتح کے جھنڈے لہراتے ہوئے کیوں نہیں آتے! کچھ لوگ یہ بھی سوچنے لگے ہیں کہ اگر ہم ان کھلاڑیوں کی جگہ اپنے مویشی کھیل کے میدان میں بھیجیں تو وہ زیادہ تنومندی کا مظاہرہ کر سکیں گے راوی اپنی رائے محفوظ رکھتا ہے۔

پنجابی دال۔ جیسا میں نے کہا ہے۔ کچھ دالیں کھانے کے لئے ہوتی ہیں، کچھ پینے کے لئے، پنجابی دال کو۔ چبانا پڑتا ہے۔ اس قدر گاڑھی ہوتی ہے کہ آپ چاہیں تو اسے چھری سے کاٹ سکتے ہیں گاڑھی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کالی بھی ہوتی ہے۔ چاہے ثابت ماش کی دال ہو یا چھولے کی دال، اگر آپ کو کبھی امرتسر سے کلکتے تک گرانڈ ٹرنک روڈ سے سفر کرنے کا موقع ملے تو راستے میں آپ کو جگہ جگہ پنجابی ڈھابے ملیں گے جہاں یہ کالی دال بکثرت ملتی ہے اور اس قدر لذیذ ہوتی ہے کہ پیشتر اس کے کہ آپ اپنا ہاتھ روکیں آپ دو روٹی تنور کے ساتھ چار کٹوری دال کھا چکے ہوتے ہیں۔ گو اس عمل کے دو گھنٹے کے بعد معدے کی وہ حالت ہوتی ہے کہ جی چاہے تو گوبر گیس پلانٹ لگا لیجئے۔ ہفتوں کام دے گا۔

انسان کی طرح دال کے بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ مونگ اور چنے کے یونٹ کی دالیں ہرے رنگ کی ہوتی ہیں۔ ارہر کی دال پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ لوبیئے کی دال لال رنگ کی ہوتی ہے۔ دونوں کو ملا کر کھلائیے تو آدمی غصے سے لال پیلا ہونے لگتا ہے۔

میں نے کچھ بنیوں کے ہاں بے حد سرخ رنگ کی دال بھی دیکھی ہے۔ جسے ہمارے دوست اور اشتراکی شاعر نیاز حیدر بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ سنا ہے اس دال کے کھاتے ہی اشتراکیت کے سارے رموز و اسرار چشم زدن میں آشکار ہو جاتے ہیں ان دالوں کے رنگ میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ اگر ان میں کچھ کالا کالا پڑ جائے تو فوراً

دکھائی دینے لگتا ہے۔ جرأت کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

مُنہ پہ بکھرے بال ہیں سب اور ٹوٹا کان کا بالا ہے
ہم نے تو معلوم کیا کچھ دال میں کالا کالا ہے

یہ دال میں کالا کالا کی ترکیب کسی غیر پنجابی لغت دان کی ایجاد ہے ورنہ پنجابی دال میں تو سب کچھ کالا کالا ہوتا ہے۔

ہمارے زمانے میں اردو کی پہلی کتاب میں پنڈت جی کی بہلی ہوتی تھی اور مولوی صاحب کا گھوڑا ہوتا تھا۔ جب عمر میں ذرا آگے بڑھے تو شرپسندوں نے اس شر کو بڑھاوا دیا۔ اب ہندو کی لٹیا تھی۔ مسلمانوں کا لوٹا، ہندو کی دھوتی تھی، مسلمان کا تہمد، ہندو کی رسوئی تھی۔ مسلمان کا باورچی خانہ! ہندو کی دال تھی۔ مسلمان کا گوشت۔ اسی 'کی'، 'کا' کی جنسی اشاریت اور فرقہ واریت نے ملک کا بٹوارہ کر دیا۔ اس وقت کسی نے نہ سوچا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اس برصغیر میں گوشت کا گوشت تیرہ روپے کلو بکنے لگے گا۔ اب کیا ہندو کیا۔ مسلمان سب ہی دال کھاتے ہیں اور 'کی'، 'کا' کی بحث سے کتراتے ہیں۔

اسی 'کی'، 'کا' کی بحث میں ان دنوں اردو ہندی کا جھگڑا بھی زور پکڑ گیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے سُنے گئے کہ ہندی صرف ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو پہ صرف مسلمانوں کا تصرف جائز ہے۔ آج کل بھی ایسے سرپھروں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

دراصل کسی زبان کی ماہیت، ماخذ، اور مزاج کو سمجھنے کے لئے اس کے محاوروں کے چلن کو بھی سمجھنا پڑتا ہے اور اس امر سے تو ہر کوئی واقف ہے کہ جو شئے زیادہ سے زیادہ استعمال میں آتی ہے۔ وہی محاوروں اور اُس زبان کی تراکیب میں شامل ہوتی ہے۔

اب آپ اُردو کی کوئی سی لغت اُٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو دال روٹی کا محاورہ ملے

گا۔ دال گوشت کا نہیں۔ دال دلیہ کا ذکر ملے گا۔ دال قورمے کا نہیں۔ لوگ دال نے عین بولتے ہیں۔ گوشت نے عین کوئی نہیں بولتا۔ بس اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ سارے ملک کی زبان ہے۔

قاعدے سے پہلے مجھے دال بگھارنے سے دال گلنے کا ذکر کرنا چاہیئے تھا اور یہ کوئی آج کی بات نہیں۔ شروع ہی سے سنتے آئے ہیں کہ دال نہیں گلتی۔ غریب کی امیر کے سامنے نہیں گلتی۔ امیر کی حاکم کے سامنے نہیں گلتی۔ مگر میرا تجربہ کہتا ہے کہ دال بہ آسانی گل سکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ اپنی دال کو خوشامد کی دھیمی دھیمی آنچ پر پکائیں اور کسی چمچے کی مدد سے بار بار ہلاتے جائیں۔ بلکہ اگر ہو سکے تو خود ہی چمچہ بن جائیں۔ اس کے بعد بھی اگر دال نہ گلے تو اپنی دیگچی کے گرد کسی صاحب ثروت کا تعویذ باندھیں۔ اس پر بھی دال نہ گلے تو کسی معروف دال گلیئے سے رجوع کریں۔ آج کل ہر چھوٹے بڑے شہر میں آپ کو ایسے دال گلیئے مل جائیں گے جو سکہ رائج الوقت مناسب تعداد میں لے کر ہر قسم کی دال گلا سکتے ہیں۔ آزمودہ ہے۔

سنتے ہیں کہ تغلق کے زمانے میں جب ایک افغان سردار بہ سلسلۂ ملازمت براستۂ خیبر ہندوستان وارد ہوتا اور جب یہاں اس نے ہر کس و ناکس کو دال سے روٹی کھاتے دیکھا تو حیرت میں رہ گیا بولا "خو، تم کیسا جنگلی لوگ ہے۔ اناج کو اناج سے کھاتا ہے؟" اس پر کسی نے اسے جواب دیا: "تم اناج کا ذکر کرتے ہو یہاں آدمی کو آدمی کھا جاتا ہے اور کسی کو حیرت نہیں ہوتی۔"

اس پر وہ افغان سردار مایوس ہو کر اپنے وطن لوٹ گیا تقریباً اسی زمانے میں سنا ہے مولانا حافظ رحمت علیہ بھی تشریف لائے تھے اور کسی سرائے میں ٹھہرے۔ سرائے کی شوخ چشم بھٹیارن نے انہیں ایسی عمدہ دال پکا کے کھلائی کہ عش عش کر اٹھے اور جاتے جاتے

سمرقند و بخارا کی دونوں ولایتیں اُسے بخش نہ گئے

حافظ کا وہ مصرعہ تو آپ نے سنا ہو گا۔

بہ دالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

کچھ تنگ نظر لوگ یہاں "دال" کے بجائے "خال" کا ذکر کرتے ہیں، یعنی بہ دالِ ہندوش بخشم کی جگہ بخالِ ہندوش بخشم پڑھتے ہیں۔ مگر یہ حافظ کے ساتھ سراسر بے انصافی ہے کیا حافظ نے ایرانی گلعذاروں کے خال نہیں دیکھے تھے جو یہاں کے خال پہ حال بہ آجاتے۔ یقیناً یہاں دال ہی کا ذکر ہے۔

مگر یہ وہ زمانہ تھا جب اِدھر کے لوگ اُدھر نہیں جا سکتے تھے۔ اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ چنانچہ جب میں ہیڈ کلرکی کے عہدے سے ریٹائر ہوا تو سوچا اس گمنامی کی زندگی میں پڑے رہنے سے کیوں نہ سمرقند اور بخارا جایا جائے جو مولانا حافظ ہمیں بخش گئے ہیں۔

خیر کسی نہ کسی طرح سمرقند پہنچے۔ مگر کسی نے نوٹس ہی نہ لیا۔ بخارا گئے۔ وہاں بھی یہی حال ہوا۔ ہم نے حافظ کے شعر کا حوالہ دیا تو بولے۔ آج کل سمرقند اور بخارا دونوں سوویت روس کی تحویل میں ہیں۔ میں نے کہا۔" مگر مولانا حافظ تو ہمیں بخش گئے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ویسی ہی دال پکا کر دکھا دیں۔" وہ بولے۔" میاں دال کوئی کھاتا ہی نہیں"۔ اس پر ہم کچھ چراغ پا ہوئے۔ وہ لوگ سیخ پا ہوئے۔ آخر ہم کر دن جھکا کر خاکپا ہوئے

سوچ لیا۔ آئندہ کسی شاعر کا اعتبار نہیں کریں گے، اگر وہ سمرقند کے بجائے شکر قند اور بخارا کی جگہ آلو بخارا ہی ہمیں نہ بخش دے ہم کبھی اعتبار نہ کریں گے۔

سوالات وجواب

۱ :۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ کو دوسروں کی دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اپنی دال میں نہیں۔ ؟

جواب کے لئے بغلیں جھانکیئے۔

۲ :۔ دال دیکھ ۔ دال کی دھار دیکھ ۔ کس قسم کی دال کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور کیوں ؟ ——— جن طالب علموں کے پاس تیرنے کی سند موجود نہ ہو جواب دینے کی کوشش نہ کریں۔

۳۔ دال گلنے کے طریقے بتائیے۔ اگر ان طریقوں کے استعمال سے آپکے ساتھ آپ کا ضمیر بھی گل جائے۔ تو آپ کیا کریں گے ؟ ——— ویسے اس سوال کا صحیح حل میرے پاس بھی موجود نہیں ہے۔

ایک دوست کی موت پر

پہلی بار جب میں نے اسے دیکھا تو وہ کانچ کے ایک خوبصورت دریچے کے پیچھے کھڑا ہو کر بڑے باوقار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے میں نے پسند کر لیا کیونکہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں اپنے آپ کو پسند کرا لیتے ہیں۔ وہ بالکل لانبا سیدھا کسی تربیت یافتہ فوجی نوجوان کے انداز میں کھڑا تھا۔ گندمی رنگ، گول چہرہ چیتے کی سی پتلی کمر اور مضبوط دھڑ سے اس کی وجیہہ شخصیت کا اندازہ کرتے ہوئے میرے دل میں بے اختیار اس کے لئے ایک گہری کشش محسوس ہوئی کہ میرا دل اس سے ملاقات کرنے اسے جاننے پہچاننے اسے اپنا دوست بنانے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ اس کی شخصیت میں سب سے اہم اس کے بال تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے باوقار مردانہ چہرے پر ایسے خوبصورت بال نہیں دیکھے۔ اس کے سر کے بال گہرے سنہرے تھے ایسے گھنے اور ملائم گویا ریشم کے لچھے اس کی مغرور مسکراہٹ دیکھ کر مجھے احساس

ہوا جیسے اسے بھی اپنے خوبصورت بالوں کی اہمیت کا احساس ہے۔ اس کے بال دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں ان میں انگلیاں پھیروں انہیں اپنے گالوں سے لگا لوں انہیں چوم لوں ان میں ڈوب جاؤں، میں بے اختیار کار کا بڑا دروازہ کھول کر اس سے ملنے کے لئے اندر چلا گیا۔

اب تو ہر روز میری اس سے ملاقات ہوتی ہے اور میں ہر روز بڑے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوں اس کی ریشمیں زلفوں سے کھیلتا ہوں کبھی ان سے اپنی ٹھوڑی گدگداتا ہوں، کبھی اپنے گال، کبھی اس کا سرپانی سے بھگو دیتا ہوں، کبھی اسے تولئے سے پونچھ کر صاف کر دیتا ہوں اور میرا دوست اب میری کسی حرکت پر معترض نہیں ہوتا کیونکہ وہ میرا شیونگ برش ہے شروع کے چند دنوں میں وہ مجھ سے کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہا اس کے بال مجھے چبھتے تھے۔ میری انگلیاں اس کی بتلی رسے پھسل جاتی تھیں، کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرے رخساروں سے چھوتے ہی اس کا سارا بدن مجھ سے بغاوت کر رہا ہے اپنی شخصیت کی حفاظت پر تل گیا ہے مگر ہر نئی دوستی اور رفاقت میں یہی ہوتا ہے۔ شروع شروع میں نئے دوست ایک دوسرے کو جانچتے ہیں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں ایک دوسرے کے قریب آتے آتے بھی اپنی ذات کو بچانے پر مجبور ہوتے ہیں مبادا کہ ان کی شخصیت مجروح ہو جائے، دوستی میں ایک باقاعدہ توازن اور فاصلہ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں، ہر نئی دوستی میں یوں ہی ہوتا ہے، سپردگی کی وہ منزل بہت دور ہوتی ہے جب توازن ٹوٹ جاتے ہیں فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ فاصلے مٹ جاتے ہیں اور جھجک غائب ہو جاتی ہے اور ایک آدمی دوسرے آدمی کو سمجھتے ہوئے بے جھجک اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینے پر تیار ہو جاتا ہے اور اپنی

روح کے سارے دروازے اپنے دوست کے لئے کھول دیتا ہے یہ منزل سمجھ کی اور سپردگی کی، ایک دوسرے میں ڈوب جانے کی بہت دیر میں آتی ہے۔ اس کے لئے وقت چاہیئے اور دل کا درد اور وہ لذت آشنا کیفیت جو کچھ پانے سے نہیں بلکہ کچھ کھونے سے پیدا ہوتی ہے اس لئے شروع شروع میں وہ مجھ سے کچھ کچھ اکھڑا رہا۔ کبھی اس کے بال مجھے چبھتے، کبھی بار بار بھگونے سے بھی اس کے بالوں میں نرمی نہ آتی، بار بار رگڑنے سے بھی رخساروں پر وہ جھاگ نہ آتا جس کی مجھے توقع تھی اور میں سوچنے لگا کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی اسے پانے میں، اسے اس قدر اپنے قریب لانے میں؟ ہر نئی دوستی کے شروع میں کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ جیسے آپ مغائرت کی دیوار کو گھونسا مار رہے ہیں اور وہ دیوار نہیں ٹوٹتی اور دوسرے فریق کی مدافعت کی وجہ سے نہیں ٹوٹتی۔ جیسے اس دوستی کو آگے بڑھانے میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے صرف دوسرے فریق کا قصور ہے، ہر آدمی اپنے اعتقادات، خیالات اور اندھی غرض سے اس قدر بندھا ہوتا ہے۔ کہ دیوار کی دوسری طرف نہیں دیکھ سکتا، دوستی کے پہلے دن اس ہوا کی طرح ہوتے ہیں جو گرم گھٹی راتوں میں سانس روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور شبنم کی پہلی بوند یا پھولوں کی پہلی خوشبو کا انتظار کرتی ہے۔

انہی دنوں ایک دن میں نے غصے میں آکر شیونگ برش کو نیچے زمین پر پٹخ دیا، زمین پر گرتے ہی برش باتھ روم کے سفید اور سخت ٹائلوں سے ٹکرایا اور لڑھکتا ہوا اس گندی آہنی جالی پر جا گرا جس کے نیچے گندی موری بہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ دھڑ کے قریب اسے چوٹ آئی ہے کمر کے قریب ایک جگہ سے اس کا سنہرا پالش اتر گیا ہے اور اس کے سنہرے بال صابن کے سفید سفید جھاگ میں تھرتھراتے ہوئے آہنی جالی کے کوڑے میں غلیظ ہو چلے

ہیں، سفید سفید جھاگ والے شیونگ برش کو یوں گندگی میں گرتا دیکھ کر مجھے شرمندگی کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے کسی صاف ستھرے دھلے دھلائے بچے کو اٹھا کر کسی گندی موری میں پھینک دیا ہو۔

جلدی سے بڑھ کر میں نے اپنے شیونگ برش کو زنگ آلود آہنی جالی سے اٹھالیا اور دیوار گیر سنک کی ٹونٹی کھول کر اسے دھونے لگا۔ اسے ٹونٹی کے زوردار کھلے پانی کے نیچے رکھ کر میں اپنے ہاتھوں سے اس کی غلاظت دھونے لگا، جو میری ہی دی ہوئی تھی میں نے بار بار اس کا سر پانی سے دھویا۔ بار بار صابن لگایا اور دھویا اور جب برش خوب اچھی طرح صاف ہو گیا تو میں نے بڑی احتیاط سے اسے تولئے سے پونچھا۔ اس کا سر خشک کیا اور پھر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا تو مجھے ایسا احساس ہوا جیسے اس کے بال انتہائی نرم اور ملائم ہو چکے ہیں اور پھر میں نے دیکھا کہ جب میں اس کے بال دائیں اور بائیں گھماتا ہوں تو سخت اور کھردرے معلوم ہوتے ہیں، یکایک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور معلوم ہوا کہ اب تک میں اپنے دوست کو غلط گھما رہا ہوں۔ نئی دوستی میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔" شیونگ برش نے ایک میٹھی شکایت کے لہجے میں مجھ سے کہا" اپنی غرض سے مجبور ہو کر اکثر انسان اپنے دوست کی شخصیت نہیں دیکھتے اس کا طریق کار اور زاویہ نگاہ بھول جاتے ہیں اور اسے غلط طریقے سے گھمانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ایک ذرا سی سمجھ سے معاملہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

میں نے اس کے نرم نرم بال دائیں سے بائیں گھماتے ہوئے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔" تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی!"

شیونگ برش نے جواب دیا" دوستی ہی کیا جس میں زخم نہ ہوں۔"

شیونگ برش سے یہ میری پہلی بات چیت تھی بہت سے انسان صرف انسانوں سے بات کرتے ہیں۔ کچھ لوگ جانوروں کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں لیکن اس سے آگے کوئی نہیں بڑھتا حالانکہ اگر غور کیا جائے تو اس دنیا کی ہر چیز بولتی ہے۔ کرسی بات کرتی ہے کھڑکیاں گویا ہوتی ہے۔ دیوار سرگوشی کرتی ہے۔ گل دان کے پھول نغمہ سناتے ہیں اور راستے کے پتھر ہر آن کچھ کہتے جاتے ہیں۔ محبت، شفقت اور رفاقت سے ہر چیز بولتی ہے۔ سننے اور سمجھنے والا موجود ہو تو کائنات کی کوئی ایک شے کسی دوسری شے سے الگ نہیں رہتی اس لئے اب کی بار جو میں نے اسے پانی میں بھگو کر صابن لگایا اور اسے اپنے رخسار پر دائیں سے بائیں گھمایا تو مجھے اس کے بال پہلے سے کہیں زیادہ ملائم اور نرم معلوم ہوئے اور شیو بھی عمدہ بن گیا اور میں نے اپنے دوست کو بدلنے کا خیال ترک کر دیا۔

آہستہ آہستہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے اور مجھے اپنے دوست کے بارے میں نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں مثلاً یہ کہ میری طرح اسے بھی ٹھنڈے پانی کے غسل سے نفرت ہے۔ سرد پانی سے اس کا جسم ٹھٹھر جاتا ہے۔ بال سخت ہو جاتے ہیں جھاگ بھی زیادہ نہیں آتا۔ بہت گرم پانی سے بھی گھبراتا ہے اس کے سر کے بال ایسے لجلجے سے ہو جاتے ہیں کہ ٹھیک سے شیو نہیں ہو سکتا۔ نیم گرم پانی اس کے لئے بہترین ہے۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اکثر میری گرفت سے پھسل جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں اس کی کمر بڑے زور سے پکڑتا ہوں۔ دوست پر جس قدر آپ کی گرفت مضبوط اور سخت ہو گی اتنا ہی وہ رسیاں تڑا کر آپ سے دور بھاگنے کی کوشش کرے گا اس لئے گرفت ہلکی ہونی چاہیئے۔ اور دباؤ مدہم۔ شیونگ برش کو پکڑنے کا بہترین

طریقہ یہ ہے کہ اسے عورت کی طرح پکڑا جائے اور عورت کو پکڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے
کہ اسے برش کی طرح تھاما جائے تبھی بہترین نتائج مرتب ہوتے ہیں اس کے علاوہ
اگلے چند مہینوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میرے شیونگ برش کو ایک خاص قسم کی صابن
کی ٹکیا پسند آ گئی ہے۔ روزالی۔ اس دوران میں نے بہت سی صابن کی ٹکیاں بدلیں۔
آسطرا، جامکو، تارا، شاہ پسند مگر کسی صابن سے وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو روزالی کی خاصیت
ہے مرد کی طرح شیونگ برش بھی حسن پرست ہے وہ اپنی صابن کی ٹکیا پہچانتا ہے۔ میں
نے شیونگ برش سے کہا، یوں دیکھا جائے تو ایک صابن کی ٹکیا اور ایک عورت میں
کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ سبھی عورتیں صابن کی ٹکیا ہوتی ہیں اسی طرح ملائم اور نرم ہوتی
ہیں اسی طرح مہکتی ہیں۔ صاف ستھری اور اجلی معلوم ہوتی ہیں پیار سے ٹھوڑی چھوتی
ہیں رخسار چومتی ہیں اور گردن میں بانہیں ڈال کر ہر روز مرد کی حجامت بناتی ہیں۔

برش بولا۔ مگر صابن کی ٹکیا گھلتی بھی تو ہے یہ شمع سا گھلنا کوئی صابن کی ٹکیا سے سیکھے
کسی دوسرے کی خاطر رفتہ رفتہ گھل کر اپنی جان دے دینا اسی مخلوق کا خاصہ ہے۔ اتنی بڑی
قربانی تو آج تک کسی شیونگ برش نے نہ دی ہو گی جس دن صابن کی ٹکیا ختم ہو جائے گی
تم بازار سے دوسری خرید لاؤ گے ٹکیا مرد کی بے وفا فطرت کو جانتی ہے۔ پھر بھی ہر آن
گھلتی ہے اور گھل گھل کر مرد کے رخسار چمکاتی ہے ایسا ایثار عورت کے سوا اور کس سے
ممکن ہے۔

میں چپ ہو رہا کیونکہ عمر عزیز کے پینتیس برس گزر جانے کے بعد بھی کنوارا تھا لیکن میں
نے اتنا ضرور کیا کہ آئینے کے سامنے اپنے شیونگ برش اور اس کی ٹکیا کو اکٹھا کھڑا کر دیا
پھر ان دونوں کو یوں ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کانچ کے کسی

بلند بالا دریچوں والے ہال کے باہر میاں بیوی مسکراتے ہوئے اپنے مہمانوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ دونوں ایسے متبسم اور خوش معلوم ہو رہے تھے کہ جیسے میں ان دونوں کو ہمیشہ اکٹھا رکھتا ہوں آئینے کے سامنے البتہ جب کبھی شیونگ برش سے خفا ہوتا ہوں تو اس کی ٹکیا کو اٹھا کر آئینے کے دوسرے کونے کی طرف الگ رکھ دیتا ہوں اس وقت میرے شیونگ برش کی صورت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ بڑا مزا آتا ہے مجھے ان دونوں کو اکٹھا کرنے میں اور پھر جب جی چاہے تو الگ کر دینے میں۔ شاید خدا کو بھی کچھ اس طرح مزہ آتا ہوگا۔

دفتر میں ایک بدنام لڑکی تھی سوفی سنا ہے کئی جگہ اس کا معاشقہ چلتا ہے وہ میرے پاس بھی کبھی کبھی آتی تھی۔ بس یوں ہی سی تھی، دبلی پتلی سانولی۔ آنکھوں کے سوا اس کے چہرے میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی بادامی آنکھیں اور ابرو کمان کی طرح تنے ہوئے شاید اسے بھی معلوم تھا کہ اس کے پاس آنکھوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لئے وہ اپنی آنکھوں سے بہت سا کام لیتی تھی اس کی آنکھیں دیکھنے کے علاوہ بولتی بھی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے سن بھی رہی ہیں۔ کبھی کبھی ہاتھ پھیلا کر اپنے پاس بلاتی تھیں کبھی کبھی آہیں بھر کر سسکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ کبھی وہ بلی کی آنکھوں کی طرح چالاک دکھائی دیتیں۔ کبھی سقراط کی آنکھوں کی طرح فلسفے میں ڈوبی ہوئی کبھی بچوں کی طرح بھولی اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک مرد اپنی آنکھوں سے کتنا کام لے سکتا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ جس کے پاس جو ہوتا ہے وہ اسی سے کام لیتا ہے۔

میں اس سے محبت نہیں کرتا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت نہیں کرتی بس یوں ہی میرے پاس چلی آتی ہے دوسروں سے اکتا کر اور وہ دوسرے بھی غالباً میری طرح

زمانے سے، حالات سے، زندگی سے ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے ہوں گے اور اسی طرح سلسلے وار ایک سے دوسرے سے تیسرے تک یہ یکسانی اور اکتاہٹ کی زنجیر چلتی ہے جس میں کسی فرم، کسی دفتر یا کسی مل کی چھوٹی سی نوکری ہوتی ہے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا نیم تاریک بدبو دار سیلا ہوا کمرہ ہوتا ہے۔ جس میں ایک طرف بانس کی کھپچیوں کے ایک شیلف پر بہت سی کتابیں اور فائلیں پڑی رہتی ہیں۔ دوسرے کونے میں کتابوں اور رسالوں کا بہت بڑا ڈھیر پڑا رہتا ہے دو تین کرسیاں ہوتی ہیں ایک ٹوٹا سا اسٹول ہوتا ہے اور ایک چھوٹی سی میز ہوتی ہے جو بیک وقت کھانے کی میز، مطالعے کی تاش کی میز اور مہمانوں کے سونے کا کام دیتی ہے جس پر کسی زمانے میں ایک خوبصورت میز پوش بچھا ہوا ہوگا جس کا گہرا سبز رنگ اب متواتر استعمال سے اور نہ دھلنے سے سیاہی مائل ہو چلا ہے۔ جس کے گلابی کنارے پر چھپی ہوئی اجنتا کی حسیناؤں کے چہروں پر پانی کے دھبے، سگریٹ کی راکھ، شوربے کی چکناہٹ، فونٹین پن کی سیاہی اور صابن کا جھاگ جما ہوا ہے اور ان سب کے بیچ بان کی ایک ڈھلنگا چارپائی ہوتی ہے۔ جس پر بیٹھے بیٹھے آدمی زندگی کے سب کام کر سکتا ہے اس پر آلتی پالتی مار کر کھانا کھا سکتا ہے۔ پائنتی پر فائلیں رکھ کر کام کر سکتا ہے، میز قریب گھسیٹ کر شیو کر سکتا ہے۔ عورت کو قریب گھسیٹ کر محبت کر سکتا ہے۔ بچے پیدا کر سکتا ہے۔ جی سکتا ہے، سو سکتا ہے۔ مر سکتا ہے۔ آخر ہمارے ایسے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک بان کی کھاٹ کے سوا اور چاہیئے بھی کیا اور میرے ایسے سست الوجود اور کاہلی کے مارے ہوئے آدمی کے نزدیک تو جنت کا تصور بان کی کھاٹ سے زیادہ نہیں ہے جس پر بیٹھے بیٹھے بھی زندگی کے سارے کام سرانجام دیئے جا سکتے ہیں اور میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ وہ کس طرح کی جنت ہوگی جس کے لئے دنیا کے لوگ دن رات

اتنی بڑی نیکیاں کرتے پھرتے ہیں یہ نیکیاں جن کے چھلکے ہوئے خول کے اندر خود غرضی کے سوا کچھ نہیں ہوتا کس طرح کی جنت ہمیں دیں گی ؟ کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے کہ آدمی بان کی ایک چھوٹی سی کھٹیا پر لیٹ جائے اور چپکے چپکے نیلا آسمان دیکھ کر رو یا کرے یا خوبصورت عورتوں کو سوتے ہوئے گلی سے گزرتے دیکھ کر مسکرایا کرے یا بلی کے بچوں کو ایک دوسرے سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوا کرے کبھی کبھی نیکی کرنے سے مجھے یہ کام بہت بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جس دن سونی آجاتی تھی اور ہمیں کوئی بیہودہ سی فلم دیکھنے کے لئے باہر نہیں جانا ہوتا تھا تو میرے کمرے کا نقشہ بدل جاتا تھا پہلے تو وہ اپنی ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر کمرے میں جھاڑو دیتی تھی پھر میرا ایک شیلف ٹھیک کرتی تھی۔ کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر کی چھان پھٹک کرنے کے بعد رسالے الگ کر دیتی تھی اور کتابیں قطار دار الگ فرش پر سجا دیتی تھی۔ میز پہ میرا سامان قرینے سے رکھتی تھی اسٹول پر رکھے ہوئے کلاک کو چابی دیتی تھی اور پھر ہاتھ منہ دھو کر میرے قریب آکر بان کی کھاٹ پر بیٹھ جاتی تھی اور میں ان تمام کاموں کے بدلے میں اسے [illegible] ہاتھ ڈال کے اُسے ایک بوسہ دیتا تھا جیسے جھاڑو بہارو کا کام ٹھیک سے کرنے پر ہم [illegible] روٹی دے دیتے ہیں۔

اسی طرح وہ کبھی کبھار آتی رہی اور زندگی کو برداشت کرنے کا یہ سلسلہ نیم بیزاری اور نیم اکتاہٹ کے عالم میں چلتا رہا لیکن ایک دن جو وہ آئی تو میں نے اسے عجب رنگ میں پایا۔ وہ بے حد کھوئی کھوئی اور گم سم اور کبھی کبھی دہشت زدہ سی دکھائی دیتی اور گھبرا گھبرا کے میری طرف دیکھتی۔ جب میں نے پوچھا کیا بات ہے تو "کچھ نہیں" کہہ کر بار بار گانے لگتی رہی

پھر پریشان ہو کر اپنی ساڑھی کا پلّو اپنی انگلی پہ لپیٹتی رہی اور کھولتی رہی۔ بار کر میں اُس کے ذہنی خلفشار کی طرف سے اَن جان بن گیا اور باتھ روم سے شیو کا سامان اُٹھا لایا اور وہیں میز آگے گھسیٹ کے اُس کے سامنے شیو کی تیاری کرنے۔ آخر وہ بولی: تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟

"کیوں کر لوں؟"

وہ بہت دیر تک چُپ رہی۔ آخر اس کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔ بالکل گھبرا کر بار بار سر ہلا کر بولی: "بس۔۔۔ ۔۔۔ میں اس زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔"

"تو اپنی مصیبت مجھ پہ کیوں لانا چاہتی ہو؟"

"تم سے نہ کہوں تو پھر کس سے کہوں؟" جواب میں میرے ذہن میں بہت سے نام آئے مگر میں چُپ رہا۔ اُس نے بڑی سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی: "کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو؟"

"نہیں۔"

غالباً اس جواب کی اُسے توقع نہیں تھی کیونکہ یہ سنتے ہی اُس نے فوراً میرا ہاتھ چھوڑ دیا ایک لمحے کے لئے میری طرف پھٹی پھٹی لگاہوں سے دیکھا پھر ٹھس ہو کر بیٹھ گئی اور میں چُپ چاپ شیو بناتا رہا اور جب شیو بنا چکا تو اُس نے صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا شیونگ برش اُٹھا لیا اور اُسے دھیرے دھیرے اپنے رخساروں پر پھیرنے لگی: کیا کر رہی ہو؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مرد بننا چاہتی ہوں۔" اُس نے سسکتے سسکتے کہا۔

جب وہ چلی گئی تو شیونگ برش نے مجھ سے کہا: "تم کتنے کڑوے اور کھردرے ہو۔ کیا تم میری طرح کسی دوسرے کی مصیبت پر جھاگ نہیں لگا سکتے۔ جھاگ لگانے سے زندگی کے بہت سے کانٹے نرم پڑ جاتے ہیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟"

"سب سمجھتا ہوں" میں نے کہا "لیکن کیا کروں؟ میرے ذہن میں جس بیوی کی تصویر بسی ہے اس پر سوتی پوری نہیں اُترتی اور جو پوری اترتی ہے، اُسے حاصل کرنے کے لئے میری تنخواہ پانسو ہونی چاہیئے۔ تم سمجھتے ہو، میں شادی نہیں کرانا چاہتا مگر کس سے کروں شادی اور کہاں ہے وہ گھر جس کے آنگن سے مجھے آسمان نظر آتا ہو اور کہاں رکھوں گا میں اپنے بچوں کو؟ اس نیم تاریک بدبو دار مرغیوں کے ڈربے میں؟ تو پھر ہم اپنے آپ کو انسان کہتے ہیں۔ صاف صاف مُرغیاں اور بھیڑیں اور بکرے کیوں نہیں کہتے۔ اس لفظی رعایت کا کیا فائدہ؟ جب کہ میری تنخواہ ایک سو ساٹھ روپے ہے اور سال میں تین روپے کی ترقی مجھے ملتی ہے اور تین سال بعد جب میرے ہاں تین بچے ہو جائیں گے تو جناب! میں تو اُن تین بچوں کو نو روپے ماہانہ پر نہیں پال سکتا۔ اگر میں اپنے خوابوں کی دیوی سے نہیں، سوتی سے بھی شادی کر لوں تو بھی نہیں پال سکتا۔"

دوسرے دن دفتر میں سوتی مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ معلوم ہوا کہ اس نے استعفا دے دیا ہے اور کہیں چلی گئی ہے۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ اس طرزِ عمل کی مجھے اُس سے اُمید نہ تھی۔ میں تھوڑا سا خوش بھی ہوا کہ چلو کسی نے میری خاطر اپنے آپ کو پریشانی میں توڈالا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی کچھ ہوں۔ پھر میرے خیال نے دوسری راہ اختیار کی اُونہہ؟ کہیں جھنجلا کر چلی گئی ہو گی۔ کسی نہ کسی سے وہ ضرور شادی کر لے گی۔ کوئی نہ کوئی احمق اُسے ضرور مل جائے گا۔

دن پھر اُسی یکسانی سے گزرنے لگے۔ اُسی اکتاہٹ اور بیزاری سے جو میری طبیعت کا خاصہ بن چکی تھی۔ اس دوران جُون آئی جس کے بال بھورے تھے اور ایملی آئی جس کی آنکھیں بھوری تھیں اور وہلا آئی جس کی ناک چپٹی تھی اور ـــ نام گنانے سے کیا فائدہ؟ اُن سب

کی صورتیں گو مختلف تھیں لیکن وہ سب ایک سی تھیں۔ وہ سب بہت سوں میں سے کسی ایک
کو تلاش کر رہی تھیں اور ہم بھی بہتوں میں سے کسی ایک کو ڈھونڈ رہے تھے اور ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے ہم سب لوگ کسی بہت بڑے کھنڈر میں آ نکلے ہیں اور ایک دوسرے کے
چہروں کی بھول بھلیّوں میں اپنا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایک راستہ دوسرے راستے کو کاٹتا
ہے، ایک چہرہ دوسرے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک نگاہ گہری پہچان کی ملتی ہے۔
مگر دوسرے ہی لمحے وہ چہرہ مکمل اجنبی ہو جاتا ہے اور راہی مایوس ہو کر پھر اپنی تلاش پر آگے
دوڑنے لگتا ہے اور سارا کھیل یوں لگتا ہے جیسے کسی اندھیری غلام گردش میں بہت سے چوہے
مختلف سمتوں میں ایک دوسرے پر پھلانگتے ہوئے جا رہے ہوں۔

اپنی بے معنی، بے مقصد زندگی سے عاجز آکر میں نے ایک دن فرم کی ملازمت سے
استعفادے دیا اور سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہو گیا کیونکہ جب کبھی کوئی نیا وائسرے
ہندوستان میں آتا تھا، میرا جی اس کا گلا گھونٹ دینے کو چاہتا تھا۔ مجھ سے پہلے میرے باپ
کا بھی یہی جی چاہتا تھا اور اس سے پہلے میرے باپ کے باپ کا اور اس طرح نسلوں اور
پشتوں سے جمع ہوتی ہوئی یہ نفرت مجھ تک پہنچی تھی اور جب اس نفرت کی حدّت سے میرا خون
کھولنے لگا اور جب فرم کے انگریز منیجر کو دیکھ کر مجھے بخار سا چڑھنے لگا تو میں نے فرم کی
ملازمت چھوڑ دی اور سول نافرمانی کی تحریک میں حصّہ لینے لگا کیونکہ نفرت ایک مرض ہے اور
جب تک آدمی اسے اپنے جسم اور روح کی اسٹیم سے خارج نہ کر دے، اُسے چین نہیں آسکتا
اس لئے جب مجھے دو سال کی قید ہوئی تو قرار سا آگیا، دل کو ایک تسکین سی ہوئی جیسے مرض
سے نجات مل گئی ہو۔ جیل کی زندگی سے مجھے کسی طرح کی حیرت نہیں ہوئی۔ جو آدمی زندگی بھر
ایک تنگ و تاریک کھولی میں رہنے کا عادی ہو، اُسے جیل کی بیرکیں کیوں بُری معلوم ہوں

گی۔ جس آدمی نے اپنی ساری زندگی جھونپڑے جیسے ڈھابوں کا غلیظ کھانا کھا کر بسر کی ہو اُسے جیل کا کھانا کیوں بُرا معلوم ہوگا۔ جو آدمی ایک چھوٹی سی میز پہ چار فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی میز پہ ایک کونے میں صبح و شام تک سر جھکائے دس گھنٹے کام کرنے کا عادی ہو، اُسے جیل کی مشقت سے کیا تکلیف ہوگی؟ یہ جیل بہت بڑی تھی اور اس میں سینکڑوں قیدی تھے اور لمبی لمبی دیواروں کے اندر گھاس کے میدان تھے اور درختوں کی قطاریں تھیں اور پھولوں کے قطعے تھے اور رات کو بیرکوں کے باہر چاند کی چھٹکتی تھی اور ہارسنگھار کے پھولوں کی خوشبو آتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آسمان نظر آتا تھا اور دو وقت ہر ایک کو کھانا ملتا تھا جو جیل سے باہر ہر کسی کو کہاں ملتا ہے اور رہنے کو ایک فرش اور ایک چھت ملتی تھی۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ سردیوں میں جب فٹ پاتھ بہت ٹھنڈے ہوتے ہیں اور برساتوں میں جب وہ بہت گیلے ہوتے ہیں، بہت سے غریب لوگ، بے گھر لوگ چھوٹے موٹے جرائم کر کے جیل آجاتے ہیں اور مزے سے تین چار ماہ گزار کر چلے جاتے ہیں۔ وہ لوگ دراصل جرم نہیں کرتے بلکہ حالات سے ایک طرح کی سول نافرمانی کرتے ہیں اور یہ سول نافرمانی ہزاروں سال سے جاری ہے اور بڑی بڑی جیلوں کے باوجود اُس وقت تک جاری رہے گی، جب تک باہر کی دنیا میں عام آدمیوں کو وہ سہولتیں بہم نہ پہنچائی جائیں گی جو بڑی سے بڑی جیل میں بھی ایک عام قیدی کو حاصل ہوتی ہیں۔

جیل میں مجھے تیسرے درجے میں رکھا گیا تھا جہاں میری طرح کے سینکڑوں لوگ مجھ سے پہلے سے موجود تھے اور جن کی زندگیاں مسلسل ایک تیسرے درجے کا سفر کر رہی تھیں۔ یہاں ہم سب لوگوں کو ایک سے کپڑے دیئے گئے تھے اور مزے کی بات یہ تھی

کہ ہمارا کوئی نام نہیں تھا۔ ہم سب بے نمبر تھے اور میرا نمبر ۵۱۴ تھا اور میری بیرک کے تالے کا نمبر ۱۱ تھا اور میرے شیونگ برش کا نمبر ۳۲۱ تھا اور یہاں آکر پہلی بار میں نے ایک انسان کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایک آہنی تالے اور لکڑی کے ایک شیونگ برش کے بہت قریب محسوس کیا اور شاید اسی لئے بہت محفوظ بھی ہوا اور مجھے اندازہ ہوا کہ میری طرح کے شست اور کاہل انسانوں کے لئے جیل بہترین جگہ ہے، جو لاکھوں آدمیوں کو جنگ کی بھٹی میں نہیں جھونک سکتے جو پان کی ایک کھٹیا پر لیٹ کر صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔

میں جیل میں اپنا شیونگ برش لے گیا تھا اور جیل کے ساتھیوں میں میرا شیونگ برش بہت مقبول ہو گیا تھا کیونکہ وہ واقعی ایک عمدہ شیونگ برش تھا اور بڑی محنت سے اپنا کام کرتا تھا حالانکہ جیل میں عمدہ صابن اور عمدہ بلیڈ دستیاب نہیں ہو سکتے تھے پھر بھی شیونگ برش بڑی تن دہی سے اپنا کام کئے جاتا تھا اور ہر روز تقریباً دس بارہ آدمیوں کے شیو کرتا تھا۔ ان آدمیوں میں اَنّا دُکا بھگیلوا ہیر بھی تھا۔ بھگیلوا ہیر ساڑھے چھ فٹ کا اونچا لمبا احمق تھا جو انگریزوں کی فوجی ٹرین کے آنے سے قبل ریل کی پٹڑی اکھاڑتے ہوئے پایا گیا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے صرف سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ اُس کی چھاتی بڑی چوڑی تھی اور داڑھی بڑی سخت اور گردن بیل کی طرح مضبوط تھی۔ وہ اکثر اپنے وارڈروں سے جھگڑا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بالکل پاگل ہو گیا، اُس نے اپنے وارڈر کا جبڑا توڑ دیا۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، میرا آئینہ توڑ دیا اور میرے شیونگ برش کو بار بار اٹھا کر دیوار پہ دے مارا حتیٰ کہ اس کے خول کا کرومیم نما چھلا ٹوٹ گیا اور میرے شیونگ برش کے سارے خوبصورت بال زمین پر گر گئے۔ بڑی مشکل سے ہمارے بہت سے ساتھیوں نے اُسے تھاما اور اُسے پکڑ کر وارڈروں کے حوالے کر دیا۔ اگر شیونگ برش اس قدر خوبصورت اور کار آمد نہ

ہوتا تو کسی کو اُس سے ہمدردی نہ ہوتی مگر میرا شیونگ بُرش خوبصورت اور کار آمد ہونے کے علاوہ بے قصور بھی تو تھا اس لیے کسی نے اس کا ٹوٹا ہوا چھلا اُٹھایا، کسی نے اس کا لکڑی کا خول۔ دو تین آدمیوں نے مل کر اُس کے نرم اور ملائم بال چُن کر جمع کیے ایک وارڈر نے بالکل اسی سائز کا پیتل کا چھلا مجھے دینے کا وعدہ کیا اور دو تین دن کی سرجری اور مرہم پٹی کے بعد میرا شیونگ بُرش پھر اپنے محاذ پر موجود تھا۔ اس کے جسم پر بہت سے زخموں کے نشان تھے اور اس کے سر کے کچھ بال بھی غائب تھے اور نصف سے زیادہ اس کا پالش بھی نکل گیا تھا اور اس کی چوبی ہتھی پر کرومیم کے بجائے پیتل کا ایک بدنما چھلا تھا مگر وہ پھر سے کام کر رہا تھا اور اپنی زندگی، افادیت اور شخصیت کا ثبوت دے رہا تھا۔ گو وہ اب جوان نہ رہا تھا خوبصورت نہ تھا بلکہ کسی قدر عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا اور بہت مدت بعد مجھے اس کے لہجے میں شکایت سی محسوس ہوئی "تم اپنے دوستوں کو برتنا نہیں جانتے"۔ وہ بولا۔ "اس کم بخت بھگیلو کے بال بڑے سخت ہیں۔ اُسے میرے جیسا بُرش نہیں چاہیئے؟ سور کے بالوں والا بُرش چاہیئے۔ تم نے مجھے اس کے حوالے کیوں کیا؟ میں ایسے سخت بالوں اور کرڑے رخساروں پر کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ دوستی وہیں مضبوط ہوتی ہے جہاں شدید اختلاف کے باوجود کچھ قدریں مشترک ہوں۔ تم نے میرے اور بھگیلو کے درمیان کون سی قدر مشترک دیکھی؟ دوست کو غلط ہاتھوں میں نہیں دینا چاہیئے۔ یہ دوستی کی توہین ہے"۔

"اتنے رئیس مت بنو۔ مت بھولو کہ تم ایک غریب آدمی کے بُرش ہو اور بھگیلو بھی ایک غریب آدمی ہے اور یہی غریبی تم دونوں میں مشترک ہے"۔

"لیکن میرا قصور کیا تھا؟" بُرش نے پوچھا۔

"تم بے گناہ تھے۔ اس سے بڑا قصور اس دنیا میں اور کیا ہو سکتا ہے"۔ میں نے بُرش کو

سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بھگیلو بھی تمہاری طرح بے قصور ہے۔ اُسے غصّہ آ گیا تھا کیونکہ جب
سے وہ جیل آیا ہے، اس کی بیوی بھاگ گئی ہے، اس کے چچا نے اس کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے
اور اس کی ماں کنویں میں گر کر مر گئی ہے۔ ان حالات میں کوئی بھی شخص پاگل ہو سکتا ہے۔"
"تم میرے مالک تھے؟" بدھ سین نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "تم میری جان بھی لے لیتے تو مجھے
غم نہ ہوتا۔"

"میرے دوست! میں تمہیں امریکی شاعر وہیٹمین کے دو مصرعے ترجمہ کر کے سناتا ہوں سنو
وہ چیز جو سب کی ہے اس کا کوئی ایک مالک کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ جسے سب استعمال کرتے
ہیں، اُسے کون مار سکتا ہے؟ اگر تم نے دو دن پہلے کا وہ منظر دیکھا ہوتا جب دو درجن ہاتھوں
نے تمہاری زندگی ریزہ ریزہ کر کے جیل کے فرش سے اٹھالی اور اُسے از سر نو ترتیب دیا
تم بھگیلو کو یقیناً معاف کر دیتے کیونکہ کسی ایک شخص کی زندگی صرف اس کی اپنی زندگی ہے،
ایک شخص کی زندگی میں سینکڑوں لوگ، ہزاروں حالات اور لاکھوں کروڑوں خلیے حصّہ
لیتے ہیں۔ پھر تم صرف اپنے کیسے ہو سکتے ہو یا صرف میرے کیسے؟"

جیل سے رہا ہو کر میں اپنے شہر واپس آ گیا اور دفتر ملازمت ڈھونڈنے لگا۔ ملک آزاد
ہو چکا تھا اور اس کی آزادی کی جدوجہد کا ایک چھوٹا سا خلیہ میں بھی تھا اور بھگیلو بھی اور
ہماری طرح کے دوسرے بہت سے لوگ جن کے نام تاریخ کے کسی صفحے پر اور سڑک کے کسی
کھمبے پر نہ ہوں گے کیونکہ لوگ ہمیشہ پھولوں کو دیکھتے ہیں، کھاد کی طرح گندے میلے کچیلے غلیظ
غریب آدمیوں پر ان کی نظر کہاں جاتی ہے۔

تین ماہ کی کاوش کے بعد مجھے ایک دفتر میں ایک سو چالیس روپے کی نوکری مل گئی۔
نوکری ملنے کے چند روز بعد مجھے اپنے دوست کا مکان چھوڑ دینا پڑا کیونکہ اس کی بیوی میکے

سے آنے والی تھی اس لیے میں اپنا سوٹ کیس لے کر نکل کھڑا ہوا کسی کی تلاش میں اور سب سے پہلے میرے ذہن میں اپنے پہلے گھر کا خیال آیا۔ ممکن ہے وہ خالی ہو مگر اتنے عرصے تک اتنے بڑے شہر میں کوئی گھر خالی کیسے رہ سکتا ہے؟ اس کے باوجود میرے قدم مجھے اسی پرانے گھر کی طرف لے گئے۔ ممکن ہے اسی بلڈنگ میں کوئی دوسری کھولی خالی ہو۔ مالک مکان سے میرے مراسم اچھے تھے، وہ کوئی انتظام کر دے گا لیکن اس بلڈنگ کے اندر پہنچ کر میں مالک مکان کے دفتر میں نہیں گیا۔ جو گراؤنڈ فلور پہ واقع تھا بلکہ دو منزل سیڑھیاں چڑھ کر اپنا پرانا گھر دیکھنے گیا۔ دروازے پر تالا نہیں تھا مگر وہ اندر سے بند تھا اور کہیں اندر سے برتن کھنکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے بے اختیار دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے چاپ سنائی دی اور کسی نے دروازہ کھولا۔ میں نے دیکھا کہ دروازے پر سوتی کھڑی ہے مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دی آگے بڑھ کر اس نے میرا سوٹ کیس میرے ہاتھ سے چھین لیا اور مجھے کھینچ کر اندر لے گئی اور دروازہ بند کرتے ہی میرے سینے میں منہ چھپا کر بولی "دو سال سے میں نے یہ گھر تمہارے لئے تیار کر رکھا ہے۔ میرا خیال تھا، کبھی نہ کبھی تم ضرور آؤ گے۔ آؤ۔ دیکھو، اپنا گھر" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے زور سے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور چند لمحوں کے مکمل سناٹے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے لگے کانپتے رہے پھر اس نے آہستہ سے اپنا سر میرے سینے سے ذرا سا ہٹا کر مجھے دو تین بار زور سے سونگھا اور مسکرا کر بولی "ہائے تمہارے سینے سے کیسی کورے گھڑے کی کچی کچی خوشبو آتی ہے۔"

ہر ڈال میں پھول آتے ہیں اور ہر خلا ستاروں سے بھر جاتی ہے۔ میری زندگی بھی چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں سے بھرنے لگی اور اس نیم تاریک کھولی میں بھی گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ننھے ننھے دیوں کی طرح جگمگانے لگیں۔ دو سال بعد میرے گھر میں ایک بچی پیدا ہوئی

وہ میری گود میں بیٹھ جاتی تھی اور غوں غاں کرتے ہوئے ایک عجیب زبان میں میرا اخبار پڑھتی تھی۔ کبھی کبھی اپنا پورا ہاتھ میرے منہ میں ڈال کر میری زبان پکڑنے کی کوشش کرتی تھی اور میری ٹائی پکڑ کر اُس سے جھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ اُسے میرا شیونگ برش بھی بہت پسند تھا۔ وہ اکثر میری نقل کرتے ہوئے شیو کرنے کی کوشش کرتی اور کئی بار اُس نے صابن کے جھاگ سے اپنا چہرہ بھر لیا اور تالی بجا کر کہنے لگی "آہا، میں پپا ہوں۔ ممی دیکھو، میں پپا ہوں۔"

میں اپنی بچی کے لئے ایک خوبصورت پنگوڑا لایا اور شوبی نے اُس کے لئے بڑے خوبصورت فراک لئے اور میں نے شدید جدوجہد کے بعد سو ڈیڑھ سو روپے کی ایک بہتر ملازمت بھی حاصل کر لی کیونکہ اس بچی کے لئے میرے حوصلے اور عزائم بلند ہو چلے تھے۔ میں اپنی بچی کو بہترین کھانا دوں گا۔ بہترین کپڑے اور بہترین تعلیم اور شادی کے بعد کسی کھولی میں نہیں بلکہ پانچ کمروں والے جگمگاتے ہوئے کسی عمدہ فلیٹ میں جائے گی۔ اسی طرح ماں باپ خواب دیکھتے ہیں۔

ایک دن جب میں شیو کی تیاری کر رہا تھا اور شیونگ برش کو صابن کی ٹکیا سے رگڑ کر جھاگ پیدا کر رہا تھا، میری بیوی ایک کونے سے چلائی "دیکھو تو آشا کو کیا ہو گیا ہے؟ اس کے چہرے پر وحشت اور خوف کا شدید تاثر تھا۔ میں نے صابن سے لتھڑا ہوا شیونگ برش وہیں چھوڑا، تولیے سے منہ صاف کیا اور آشا کی طرف بڑھا اور اس کا منہ کھول کر غور سے اندر دیکھنے لگا۔ بچی کا منہ اندر سے سوجتا جا رہا تھا اور اُسے سانس لینے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ میں فوراً اسے گود میں اٹھائے سیڑھیوں کے نیچے بھاگا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے دوا اور انجکشن دیتے ہوئے بتایا کہ بچی کو ڈپتھیریا ہو گیا ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر بچی چل بسی۔

تین دن تک میں دفتر نہیں گیا، کپڑے نہیں بدلے، شیو نہیں کیا۔ اپنی کھاٹ پہ لیٹے لیٹے چھت کی طرف دیکھتا رہتا۔ ایک کونے میں پنگوڑا پڑا تھا اور اس پہ بچی کے فراک پڑے تھے جو ابھی ابھی دھوبی سے دُھل کر آئے تھے۔ "جس طرح میری بچی کے فراک دھوبی سے دُھل کر آئے ہیں کیا اسی طرح میری بچی مرگھٹ سے واپس نہیں آسکتی؟" شُوتی نے روتے روتے مجھ سے پوچھا۔ میں نے بیزار ہو کر مُنہ پھیر لیا۔ میں کیا جواب دُوں۔ میں کوئی خُدا ہوں؟

چوتھے روز شُوتی نے مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بستر سے اُٹھایا۔ "کیا اسی کھاٹ پہ لیٹے لیٹے مرجانے کا ارادہ ہے۔ دفتر نہیں جاؤ گے۔ اُٹھو، شیو کرو، کپڑے بدلو اور کام پہ جاؤ۔"

میں شیو کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ شیونگ برُش اس وقت سے صابن میں لتھڑا ہوا پڑا تھا جس وقت میں پلٹ کر بچی کا مُنہ دیکھنے کے لئے مڑا تھا۔ صابن کا جھاگ اس کے بالوں میں سُوکھ گیا تھا اور وہ اُن سفید سفید بالوں میں بہت بڈھا اور سُوکھا ہُوا اور غم زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے نل کھول کر باتھ روم میں اس کے بالوں سے سُوکھا ہوا صابن چھڑایا اور اسے اچھی طرح صاف کر کے جب شیو کرنے لگا تو مجھے اس کا لمس بے حد ملائم مکھن کی طرح نرم اور بالائی کی طرح ریشمیں معلوم ہوا۔ ایک لحظے کے لئے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو مجھے ایسا لگا گویا یہ برُش کے بال نہیں ہیں، میری بچی کی ننھی ننھی انگلیاں ہیں جو بڑے پیار اور محبت سے میرے رخساروں سے کھیلتی ہوئی صابن کے جھاگ کی دھاریاں بکھیر رہی ہیں۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی اور آنسو میرے رخساروں پہ بہہ بہہ کر صابن کے جھاگ میں ملنے لگے اور مجھے ایسا لگا جیسے میرا شیونگ برُش بھی میرے ساتھ رو رہا ہے اور انتہائی رقّت سے ہولے ہولے میرے رخسار تھپک رہا ہے۔

ڈیڑھ سال بعد ہمارے ہاں ایک اور بچی پیدا ہوئی لیکن مری ہوئی پھر تیسرے برس ایک

ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن وہ بھی مر گیا۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد شونی اچانک مجھے چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اس نے مجھے نہ کچھ بتایا، نہ کہا، نہ میرے لیے کوئی خط چھوڑا۔ چپ چاپ کہیں غائب ہو گئی۔ بہت جگہوں پر میں نے اسے ڈھونڈا اور بہت عرصے تک میں نے اس کی تلاش کی لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملی۔ میں پھر اپنی کھولی میں اکیلا رہ گیا۔

اب مجھے جو کچھ کہنا ہوتا ہے، اپنے شیونگ برش سے کہتا ہوں کیونکہ آدمی صرف نفرت کرنے والا صرف لڑنے جھگڑنے والا صرف کام کرنے والا انسان نہیں، وہ محبت کرنے والا انسان بھی ہے اور جب انسان اس کی بات نہ سنیں تو وہ کسی سے تو اپنے دل کا درد کہے گا۔ چاہے وہ لکڑی کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ آٹھ سال سے میں اور میرا شیونگ برش اس کھولی میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ میرا شیونگ برش بہت بڈھا ہو چلا ہے۔ میری طرح اس کے سر کے بہت سے بال جھڑ گئے ہیں۔ میں لکڑی کے دستے کا سارا پلستر اکھڑ چکا ہے اور لکڑی میں بھی گہری گہری دراڑیں پڑتی جا رہی ہیں اور اس کا بدنما پیتل کا خول جگہ جگہ سے یوں ہلتا ہے جیسے بڈھے کے منہ میں دانت ہلتے ہیں لیکن عمر کے ساتھ ساتھ وہ بھی بہت سیانا اور دانا ہو گیا ہے۔ میں گھنٹوں اس سے باتیں کرتا ہوں اور اس کی باتیں سنا کرتا ہوں جو اس کے لکڑی کے دستے نے کبھی جنگل کے درختوں سے سنی تھیں، جو اس کے بالوں نے غیر پالتو جانوروں سے مستعار لی تھیں۔ قدرت کا قانون، جانور کا سلیقہ اور انسان کی ہوشمندی اور زندگی کا گہرا دردناک تجربہ بھی اس میں شامل ہیں۔

آٹھ برس بعد آج مجھے شونی کا خط ملا ہے۔ سونی مجھے واپس بلا رہی ہے۔ سونی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس شادی سے اس کے دو بچے پیدا ہوئے، دونوں لڑکے۔ دونوں زندہ ہیں۔ ایک کی عمر سات سال ہے، دوسرے کی پانچ سال۔ سونی کا دوسرا شوہر مر چکا

ہے اور اب سونی اپنے دونوں بچوں کو لے کر بھی اکیلی ہے۔ شاید وہ تو اب اپنی باقی زندگی کسی شوہر کے بغیر بسر کر سکتی ہے لیکن اس کے بچوں کو ایک باپ کی شاید ضرورت ہے۔

"تمہیں جانا چاہیئے" شیونگ برش نے دوسرے دن مجھے صلاح دی۔

"میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ سونی نے مجھے دھوکا دیا، بے وفا نکلی۔"

"وہ تم سے بے وفا نہیں تھی، اپنی کوکھ کی وفادار تھی۔ ہر عورت اپنی کوکھ کی عزت کی محافظ ہوتی ہے۔" برش نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "جب دو مرے ہوئے بچے پیدا ہوئے تو سونی کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کی کوکھ کو کالک لگائی ہے اور کوئی باعزت عورت یہ کالک چھپائے بغیر نہیں رہ سکتی یہ تو زندگی کا قانون ہے کہ ہر جاندار اپنی زندگی اور تخلیق کا ثبوت پیش کرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ جس کا روان رواں سراسر تخلیق ہو، اپنے حق سے باز کیسے رکھی جا سکتی ہے اس لئے وہ چلی گئی کیونکہ اُسے اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرنا تھا اس میں نہ تمہارا قصور تھا، نہ اس کا۔ اس دنیا میں کتنے ہی درد ایسے ہوتے ہیں جن کا الزام کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔"

"اس دنیا میں کوئی کسی کا اپنا نہیں ہوتا، اپنا بنایا جاتا ہے" برش نے جواب دیا۔ "اپنائیت ایک رشتہ ہی نہیں، ایک عمل بھی ہے۔"

"بھاڑ میں جائے تمہارا فلسفہ" میں نے غصے سے جھلاتے ہوئے کہا: "میں اس کُتیا کے پاس نہیں جاؤں گا۔ ہرگز ہرگز اس کے بیٹوں کا باپ نہیں بنوں گا۔"

"شرم نہیں آتی تمہیں ایسی باتیں کہتے ہوئے۔" مجھے اُس بڈھے بُرش کے سر کا ایک ایک بال غصے سے تنتا معلوم ہوا۔ "اگر ایک جنگلی بھیڑیے کی ماں انسان کے بچے کو اپنا بیٹا بنا سکتی ہے تو تم انسان ہو کر کسی دوسرے انسان کے بچوں کو اپنا بیٹا نہیں بنا سکتے؟ بس اتنی ہی ہے تمہاری

تہذیب ؟"

یکایک میں شرمندہ سا ہو گیا کیونکہ اس کا منطق کے اندر مجھے ایک گہری اور وسیع حقیقت کی جھلک نظر آرہی تھی۔ میرا تیز و تند لہجہ خود بخود دھیما پڑ گیا اور آئینے میں دیکھ کر ذرا احساسِ ندامت سے مجبور ہو کر میں نے آہستہ سے کہا: "اچھا اچھا میں کل اُسے خط لکھوں گا۔"

"کل پر مت ٹالو۔ کل تک شاید تمہارے خلوص کی گرمی ٹھنڈی ہو جائے ابھی لکھو اسی وقت"

"اچھا لکھتا ہوں" میں نے آئینے میں اپنی محجوب صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر میں خط لکھنے کے لئے پلٹا ہی تھا کہ میرا پاؤں فرش پر پھسل گیا۔ اور شیونگ برش میرے ہاتھ سے چھوٹ کر قریب کی دیوار سے بڑے زور سے ٹکرایا اور پھر فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں خود بھی بچتے بچتے دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور پھر سنبھل کر گھٹنوں کے بل اٹھتے ہوئے کپڑے جھاڑتے ہوئے جو سیدھا ہوا تو میں نے دیکھا فرش پر میرے شیونگ برش کی لاش پڑی ہے۔ سر کہیں، دھڑ کہیں، پاؤں کہیں اور اس کا چہرہ ایک ایسے بوڑھے آدمی کے کھلے ہوئے منہ کی طرح بھیانک تھا جس کے اندر ایک دانت باقی نہ رہا ہو۔ لکڑی کی ہتھی کے چھوٹے چھوٹے درجنوں ٹکڑے ہو چکے تھے۔ پیتل کا خول ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اور شیونگ کے چند بال جو اس کے سر پہ باقی رہ گئے تھے، عجب منتشر شدہ حالات میں فرش پہ اِدھر اُدھر خاک میں بکھرے پڑے تھے۔ یکایک کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور فرش کے گرد و غبار میں اس کے بال اُڑ اُڑ کر فضا میں بکھرنے لگے۔

"تو یہ موت ہے، موت جس کا کوئی آپریشن نہیں ہوتا، جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا جو بالآخر کسی طرح نہیں ٹالی جا سکتی۔ میرے سینے سے دبی دبی ایک آہ سی نکلی۔ اس دوست نے اٹھارہ برس تک میرا ساتھ دیا۔ اس نے میری ہر کمینگی برداشت کی اور میرا ہر دکھ جھیلا

یہ میرے ساتھ چل گیا اور اندھی کھولی میں رہا اور جب سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو یہ میرے ساتھ رہا اس نے ہر مصیبت کا وار ہنس ہنس کر خالی دیا اور جب کسی نے مجھے زخم دیئے، اس نے ایک دردمند مسکراہٹ سے اس پر صابن کا نرم نرم جھاگ رکھ دیا۔

غم موت کا نہیں ہے، غم اس جانی پہچانی شکل و صورت کا ہے جو اب کبھی دکھائی نہ دے گی۔ غم شخصیت کی اس ادا کا، حسن کی اس ترتیب کا ہے جو آج ہمیشہ کے لئے مٹ گئی

غم موت کا نہیں ہے۔ غم اس مخصوص اور مانوس رشتے کا ہے جو آج ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا۔

ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتا ہوا ننگے پاؤں سے فرش پر چلتا ہوا میں اس کے قریب پہنچا اور فرش پر بیٹھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے ٹکڑے یوں چننے لگا جیسے کوئی جلی ہوئی چتا سے اپنے کسی پیارے کے پھول چنتا ہے۔

چند دن تک میں شیو نہیں کیا، یوں ہی داڑھی بڑھائے ادھر اُدھر ایک عجیب بے کلی سے گھومتا رہا۔ چند لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے میرا کوئی قریبی رشتے دار مر گیا ہو لیکن جب انہوں نے میرے غم کی وجہ پوچھنی چاہی تو میں انہیں کچھ نہ بتا سکا۔ کس سے کہتا کہ میرا شیونگ برش مر گیا ہے۔ اس دنیا میں جہاں آج کوئی ایک انسان کا رشتہ ماننے کو تیار نہیں ہے، ایک انسان کا ایک شیونگ برش سے رشتہ کون تسلیم کرے گا؟ مجھے معلوم ہے کہ غریب ماؤں کی کوکھ سے پیدا ہونے والے بیٹے اور کانچ کے دریچوں پر رکھے ہوئے شیونگ برش ہمیشہ بیچے جائیں گے لیکن ان کی روح کا درد کون دیکھے گا!

تعارف

میاں، میں کتابوں سے تعارف کی بات نہیں چھیڑوں گا، حالانکہ بعض کتابوں کا تعارف کرانا اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا کسی لڑکی سے تعارف حاصل کرنا۔ یہ مسئلہ مُردوں اور مَردوں، یا مَردوں اور نامَردوں سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا، کیوں کہ اس امر سے سب واقف ہیں کہ مردوں یا عورتوں کو اپنی ہی جنس کے افراد سے تعارف کے سلسلے میں کوئی دِقت پیش نہیں آتی۔ مَیں اس وقت صرف اس تعارف اور اس کی مشکلات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جو مجھے لڑکیوں سے جان پہچان بڑھانے کی کوشش کرتے وقت پیش آتی ہیں۔

عمر چالیس برس ہونے کو آئی، مگر ابھی تک میری شادی نہیں ہوئی۔ وجہ صرف یہ ہے کہ محبت کی شادی کرنا چاہتا ہوں، دوستوں، بزرگوں اور اخباروں کو بیچ میں لانا نہیں چاہتا۔ اور محبت کرنے سے پہلے تعارف کا ہونا ضروری ہے بعض

دوستوں نے یہ بھی صلاح دی ہے کہ پہلے محبت کر لو، بعد میں تعارف ہوتا رہے گا لیکن مجھے یہ کچھ ایسا ہی لگتا ہے کہ پہلے اسپرو حاصل کر لو، بعد میں سر درد ہوتا رہے گا۔ میری اس بات کو اسپرو کا اشتہار نہ سمجھا جائے۔ یہ روگ میں نے آج تک نہیں پالا۔ جس شخص نے چالیس برس تک عشق نہ کیا ہو اُسے سر درد بھلا کیا ہو گا، دراصل بات یہ ہے کہ اس معاملے میں کچھ لوگ پیدائشی خوش قسمت ہوتے ہیں، کچھ لوگ بدقسمت ہوتے ہیں۔ میرا شمار دفتر کے دوسرے درجے کے لوگوں میں کیا جانے لگا ہے، حالاں کہ میں اپنے دوسرے دوستوں کو دیکھتا ہوں کہ گھر پہ ایک بیوی رکھنے کے علاوہ ہر اتوار کو کسی نئی لڑکی کے ساتھ وکٹوریہ گارڈن میں بھی گھومتے نظر آتے ہیں اور میرا یہ حال ہے کہ جب بھی وکٹوریہ گارڈن گیا، مجھے درختوں کے علاوہ کسی اور سے تعارف حاصل نہیں ہوا۔ اگر یہ اپنی اپنی قسمت کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟

مگر ہمارے ہاں ایک پرانی کہاوت ہے

"خدا جسے دیتا ہے چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

مجھے بھی ایک روز اس مسئلے کا حل مل ہی گیا گو چھپّر پھاڑ کر نہیں ملا، ایک پارسل پھاڑ کر ملا، جس کے اندر سے ایک کتاب نکلی۔ کتاب کا عنوان تھا

"لڑکیوں سے تعارف حاصل کرنے کے باون طریقے"

میرے ایک دوست بشیر نے مجھ سے ایک کتاب پڑھنے کی سفارش کی تھی مگر میں چونکہ اسے اس معاملے میں اپنا ہمراز نہیں بنانا چاہتا تھا، اس لئے میں نے اس سے یہ کتاب مانگنے کی بجائے خود اسے وی پی سے منگوانا بہتر سمجھا میں مانگے تانگے کی محبت کا قائل نہیں ہوں۔ حالاں کہ لوگ کہتے ہیں کہ جس زمانے

میں تانگے ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں تانگے کے پیچھے اپنی سائیکل دوڑا دینے سے کبھی کبھی محبت حاصل ہو جاتی تھی۔ مگر آج کل مانگے سے محبت کیا ایک مٹھی ریت تک نہیں ملتی۔ اور تانگے رہے نہیں اور آج کل ٹیکسیوں کے پیچھے اپنی سائیکل دوڑانا ایسا ہی ہے۔ جیسے مجنوں کا جنگل میں جا کر لیلیٰ لیلیٰ پکارنا۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مجنوں لیلیٰ کے گھر کے سامنے جا کر اس کا نام پکارنے کی بجائے جنگل میں جا کر کیوں چیختا تھا۔ شاید اس زمانے میں تمام عاشقوں کی کھوپڑی اُلٹی ہوا کرتی تھی۔ ورنہ فرہاد اکیلا تیشہ لے کر نہر نکالنے کیسے نکل پڑتا۔ قیاس غالب ہے کہ اس زمانے میں بلڈوزر نہ ہوا کرتے تھے۔ نہ پنج سالہ پلان بنتے ہوں گے۔ آج کل پرانے طریقوں پہ عمل کر کے عشق نہیں کیا جا سکتا آج کل کی لڑکی نہر کھودنے کو نہیں کہتی، نائی لان کی ساڑی مانگتی ہے۔ جنگل میں چیخ چیخ کر اپنا نام سننے کی بجائے باغ کے کسی کونے میں دھیرے سے اپنے کانوں میں اپنا نام سننا پسند کرتی ہے۔ مگر میں بھی کہاں سے کہاں بہک گیا یہ سب تو تعارف کے بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تعارف تو ہوا ہی نہیں۔ صرف کتاب حاضر ہے اور لڑکی غائب ہے۔

رات بھر جاگ کر کتاب ختم کی۔ بہت عمدہ کتاب ہے۔ مصنف نے نئے دور کے ماڈرن مصنفوں کی طرح اس کتاب پہ بہت محنت کی ہے۔ اس نے گیارہ ہزار لڑکے لڑکیوں کے انٹرویو لے کر ان سے اپنے نتائج اخذ کئے ہیں اس طرح یہ کتاب اور اس کے باون طریقے لنکا کے باون گزے ہاتھی کی طرح زندگی کی ٹھوس حقیقتوں اور ٹھوس تجربوں پہ مبنی ہیں۔ اب ان پہ عمل کرنا اور ان سے

فائدہ اٹھانا میرا کام ہے کتاب کے اندر اور باہر کے ڈسٹ کور پر جگہ جگہ بہت سے ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جنہوں نے اس کتاب سے فیض حاصل کر کے ایک (یا ایک سے زیادہ) لڑکی حاصل کر لی۔ اب تک اس کتاب کی تیس لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ حالاں کہ نوّے صفحے کی اس کتاب کی قیمت سترہ روپے ہے خود مصنّف نے اس ایک کتاب سے لاکھوں روپے کی رائلٹی وصول کر لی ہے۔ اب اس کے چھ مکان ہیں۔ دو کُتّے ہیں اور سات مصاحب ہیں۔ معاف کیجئے غلطی ہو گئی۔ مَیں یہ کہنا چاہتا تھا کہ دو مصاحب ہیں اور سات کُتّے ہیں۔ اور پچھلے سال اس نے اپنی پانچویں بیوی کو طلاق دی ہے۔ غرض جس پہلو سے دیکھئے وہ ایک کامیاب کتاب کا کامیاب مصنّف ہے۔ سنا ہے ہالی وڈ میں اس کتاب کی بنیاد پر ایک فلم بھی بن رہی ہے مگر میرا ارادہ کوئی فلم بنانے کا نہیں ہے مَیں صرف ایک خوبصورت لڑکی سے تعارف چاہتا ہوں۔

کتاب کے مصنّف نے کتاب کے شروع میں بہتّر صفحوں کا ایک تعارف لکھا ہے کتاب کے تعارف میں مصنّف نے اس بات پر بہت زور دیا ہے اور بار بار دیا ہے۔ کہ کسی بھی لڑکی کا تعارف حاصل کرنے سے پہلے اپنے دل میں حوصلے اور ہوس، ہمت اور ڈھٹائی، برجستگی اور شگفتگی کا پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ جہاں تک ہوس کا تعلق ہے، اس کی مجھ میں کمی نہیں ہے بقیہ صفات کے لئے مجھے اپنی شخصیت کا جائزہ لینا پڑے گا۔ اور اس امتحان سے گزرنا پڑے گا۔ جو اُن باون طریقوں میں مذکور ہے۔

طریقہ نمبر ایک:۔ مصنّف کہتا ہے کہ دنیا میں صرف آپ ہی اکیلے نہیں ہیں

ہیں۔ لڑکیاں بھی اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا محسوس کرتی ہیں۔ غم ذات اور خوفناک تنہائی کا احساس آج کل سے شکستہ سماج میں، جس کی قدریں رات دن ٹوٹتی جا رہی ہیں (دن میں کم اور رات میں زیادہ) خوب صورت سے خوب صورت لڑکی بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ وہ بھی یکی محبت کی اتنی ہی پیاسی ہے۔ جتنے آپ ہیں۔ ایسی لڑکی اکثر سورج ڈوبنے سے کچھ عرصہ پہلے آپ کو باغ کے کسی کونے میں بنچ پر بیٹھی ہوئی مل جائے گی۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی کتاب پڑھ رہی ہو، یا ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے کسی سوچ میں ڈوبی ہو۔ یا پھوٹتی ہوئی شفق کے نارنجی بادلوں کو دیکھنے میں مصروف ہو۔ مگر اصل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر وہ کتاب پڑھ رہی ہے تو اس کا دھیان اپنی کتاب میں نہیں ہے۔ اگر اس نے اپنی ٹھوڑی پہ انگلی رکھی ہے۔ تو سوچنے کے لئے نہیں۔ خوب صورت لڑکیاں کچھ سوچا نہیں کرتیں۔ یہ کام مردوں کا ہے۔ اور اگر وہ شفق کی طرف سے دیکھ رہی ہے تو بھی اپنے دل میں اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا سمجھ کر اداس سی محسوس کر رہی ہے۔

ایسے میں بنچ پہ اگر کوئی دوسرا بیٹھا نہ ہو (یعنی اس کی ماں، بھائی، عاشق یا شوہر) تو آپ ہمت کر کے اس بنچ پہ بیٹھ جائیے۔ پانچ منٹ تک خاموش بیٹھے رہیے۔ لڑکی کی طرف دیکھئے بھی نہیں۔ اس سے لڑکی کو بڑا سکون اور اطمینان حاصل ہوگا۔ اس کے بعد اپنی گھڑی دیکھئے۔ اور پلٹ کر بڑی رسانیت سے پوچھیئے :-

"آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے ؟"

ظاہر ہے وہ اس معمولی سے سوال کا جواب ضرور دے گی۔ پھر آپ اپنی گھڑی درست کرنے میں لگ جائیے۔ اور گھڑی درست کرتے کرتے اپنی اور اس کی گھڑی کا موازنہ نہ کیجئے۔ اس کی گھڑی کون سی ہے؟ کتنے جیول کی ہے؟ کس دکان سے خریدی ہے؟ اور پھر آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کہاں پڑھتی ہیں؟ یا کیا کرتی ہیں؟ پھر کچھ اپنا ذکر کیجئے اور ذکر کرتے کرتے غم ذات اور ٹوٹتے ہوئے سماج کی تنہائی پر آجائیے۔ دو چار شعر پہلے ہی ازبر کر لیجئے۔ ممکن ہے کام آئیں۔ لیجئے ہو گیا تعارف۔

اندھیرے میں روشنی کی کرن پھوٹی۔ ایک راستہ نظر آیا۔ میں ہر روز باغ میں جانے لگا۔ اور اس تنہا لڑکی کو تلاش کرنے لگا۔

آخر ایک شام مجھے وہ لڑکی تنہا مل ہی گئی۔ وہ ایک بنچ پر اکیلی بیٹھی تھی۔ اُفق میں ڈوبتے سورج کی لالی دیکھتے ہوئے اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ میں اس کے قریب بنچ پر بیٹھ گیا۔ لڑکی پہلے کچھ کسمسائی، پھر یہ دیکھ کر کہ میری توجہ اس کی طرف نہیں ہے۔ اطمینان سے بیٹھی رہی۔ میں نے پانچ منٹ تک انتظار کیا پھر اس کے بعد اپنی گھڑی دیکھ کر بڑی رسانیت سے پوچھا، "آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے"؟

وہ بولی، "جو آپ کی گھڑی میں بجا ہے"

میں یہ جواب سنتے ہی چکرا گیا۔ اس جواب کی مجھے امید بھی نہ تھی۔ مصنف نے اس کا کہیں ذکر نہ کیا تھا۔ اب آگے گفتگو کیسے ہو؟ چند لمحوں کے لئے میں دم بخود ہو گیا۔ اس کے بعد میرے ذہن میں وہ سوالات آگئے جن کا ذکر مصنف نے

ترکیب نمبر ایک میں کیا تھا۔ یعنی آپ کی گھڑی کون سی ہے؟ کس دکان سے خریدی تھی وغیرہ وغیرہ؟ مگر میرے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ لڑکی بنچ سے اُٹھ گئی۔ اور ترکیب نمبر ایک بے کار ہو گئی۔ اب میں تھا اور غم ذات مگر وہ کم بخت مجھ سے دور چلی جا رہی تھی۔ یکایک اس کے قریب کی بوگن ویلیا کی جھاڑی سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان نکلا۔ اس کے ہاتھ میں بوگن ویلیا کے چند پھول تھے۔ اس نے لڑکی کو وہ پھول پیش کئے۔ لڑکی نے بوگن ویلیا کے پھولوں کی ایک تیلی سی پھولوں بھری شاخ دوہری کر کے اپنے جوڑے کی ڈینی کی طرح اڑس لی اور اس نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے چلی گئی۔

ترکیب نمبر ۲:۔ مصنف نے اس ترکیب کی کامیابی پر بہت زور دیا ہے اور کئی مثالیں دے کر اس ترکیب کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ یہ ترکیب عورت کی اس کمزوری کی بنا پر اخذ کی گئی ہے۔ جسے روپے پیسے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ بازار میں چلے جا رہے ہیں۔ بازار میں، یا گلی کے موڑ پر یا کسی سینما کے قریب اور آپ کے آگے یا پیچھے وہ جس سے تعارف مقصود ہے چلی جا رہی ہے یا چلی آ رہی ہے۔ آپ اپنی چال فوراً کم کر دیجئے۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے قریب سے گزر جائے۔ پھر آپ اپنے پرس سے دس کا ایک نوٹ نکال کر اسے آواز دیجئے۔ "اے سنیئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دس کا نوٹ آپ کے پرس سے گرا ہے"

سو میں سے ننانوے لڑکیاں اپنا پرس کھول کر اور اس کے اندر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر کہیں گی "جی ہاں یہ نوٹ میرا ہے۔ تھینک یو"

آپ دس کا نوٹ اسے دیجئے اور اس کے ساتھ چلتے چلتے، باتیں کرتے ہوئے اسے کسی کافی ہاؤس میں اپنے ساتھ کافی یا چائے پینے کی دعوت دیجئے آپ نے دس روپے کا نوٹ تھمایا ہے، یقیناً وہ آپ کی شکر گزار ہو گی۔ اور چائے کی ایک پیالی آپ کے ساتھ پینے سے انکار نہ کرے گی۔ لیجئے تعارف ہو گیا اور صرف تعارف ہی مشکل ہوتا ہے۔ آگے کی منزلیں بہت آسان ہوتی ہیں۔

اردو بازار سے دریا گنج کی طرف جاتے ہوئے مجھے وہ لڑکی مل گئی۔ لڑکی سے میری مراد ایسی لڑکی ہے جسے میں چاہ سکتا ہوں۔ خوب صورت، نازک اندام دل کش چال والی۔ وہ میرے آگے آگے جا رہی تھی اور میں اسے دل میں سراہتا ہوا اس سے چند قدم کے فاصلے پر چل رہا تھا۔ پھر میں نے اپنی چال تیز کر دی اور اس کے قریب سے گزر گیا۔ آگے جا کر میں نے اپنی رفتار دھیمی کر دی اور وہ لڑکی اپنا سبز رنگ کا پرس جھلاتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی۔ میں نے اسے جانے دیا۔ ابھی چند قدم ہی وہ مجھ سے آگے گئی ہو گی کہ میں نے اسے آواز دی۔

"ذرا سنیئے تو۔"

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس وقت میں سڑک سے دس روپے کے دو نوٹ اٹھانے میں مصروف تھا۔ میں وہ دونوں نوٹ اٹھا کر اس کے قریب گیا اور ہاتھ بڑھا کر وہ دونوں نوٹ اسے دے کر بولا، "غالباً آپ کے پرس سے گرے ہیں۔"

اس نے اپنا بٹوہ کھولا بالکل اسی طرح اندر جھانکا جس طرح مصنف نے لکھا

تھا، اور سرسری نگاہ ڈال کر بولی "میرے بٹوے کا بٹن ڈھیلا ہو گیا ہے۔ اسی لئے گر گئے ہوں گے۔ لیجئے۔ شکریہ۔"

اس دل رُبا نے ایک خاص انداز سے میری طرف مسکرا کر دیکھا، اور دونوں نوٹ لے کر اپنے پرس میں ڈال لئے۔ بٹوے کو زور سے بند کیا اور چلنے لگی میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اور جلدی جلدی اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

"بٹوے کا بٹن ڈھیلا نہیں چھوڑنا چاہئیے۔"

"جی ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"ڈھیلے بٹن بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے" میں نے اس سے کہا۔

وہ بولی "میں نے بھی آپ کو دیکھا ہے کہیں۔ لیکن یاد نہیں آرہا ہے کہ کہاں دیکھا ہے۔"

"آپ شاید سیکرٹریٹ میں کام کرتی ہیں۔"

"جی نہیں ۔۔۔۔ میں تو ۔۔۔۔" وہ تیز تیز قدموں سے چلتے، بلکہ دوڑتے ہوئے بولی "کناٹ پلیس جانے والی بس آگئی۔ مجھے وہاں جانا ہے۔ اچھا تھینک یو۔"

وہ اُچک کر بس میں سوار ہو گئی۔ چند لمحوں کے لئے میں بھونچکا سا رہ گیا۔ پھر سوچا، مجھے بھی کناٹ پلیس چل دینا چاہئیے۔ مگر بس نکل چکی تھی۔ "ذرا ٹھہرئیے"

کہہ کر میں نے چلتی بس کے پائیدان پر پاؤں رکھنے کی کوشش کی۔ یکایک میرا پاؤں پھسل گیا اور میں زمین پر گر گیا میری کہنی چھل گئی اور پتلون پیچھے سے پھٹ گئی۔ گرتے گرتے میں نے دیکھا کہ بس کی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی وہ لڑکی زور زور سے ہنس رہی تھی۔ لیجئے بس بھی گئی۔ لڑکی بھی گئی۔ ساتھ میں میرا دو ہفتے کا راشن بھی گیا۔

مصنف نے ترکیب تو اچھی لکھی تھی لیکن یہ نہیں بتایا تھا۔ کہ اگر ایسے موقع پر بس آجائے تو کیا کرنا چاہیئے۔

ترکیب نمبر ۳: مصنف کے خیال میں یہ تیر بہدف نسخہ ہے، اور کبھی بے کار نہیں جاتا۔ ایک آٹو گراف بک خرید کر لایئے، اسے ہمیشہ اپنی جیب میں رکھئے اور اس پر دو چار فلمی ستاروں کے آٹو گراف (اگر اصلی ملیں تو اصل، ورنہ جعلی سہی) لے کر یا اپنے مختلف دوستوں سے لکھوا کر رکھ لیجئے۔ پھر کسی اعلیٰ قسم کے ریستوران میں گھس جایئے۔ اور ٹیبل پر بیٹھ کر چائے، کافی کا آرڈر دیجئے۔ اطمینان سے چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالئے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کی نظر کسی ایسی ٹیبل پر پڑ جائے۔ جہاں کوئی خوش شکل خوش ادا لڑکی، اکیلی بیٹھی ہوئی نظر آجائے۔ غور سے دیکھئے۔ انتظار کیجئے۔ کہ وہ کہیں کسی دوسرے آدمی کا انتظار تو نہیں کر رہی ہے۔ چند منٹ گزر جانے دیجئے۔ پھر اپنی ٹیبل سے اُٹھ کر اس کی ٹیبل تک جایئے۔ جیب سے آٹو گراف بک نکال کر کہیے۔

"میرے خیال میں آپ ہی مشہور فلم سٹار سادھنا ہیں۔ براہ کرم اس آٹو گراف بک پر دستخط کر دیجئے۔"

وہ لڑکی یقیناً خوش ہو جائے گی۔ آج کل اگر کسی بھی خوش ادا لڑکی کا موازنہ کسی مشہور فلمی اداکارہ سے کیا جائے تو اس سے بڑھ کر اس کی تعریف نہیں ہو سکتی وہ یقیناً مسکرائے گی اور انکار میں سر ہلا کر کہے گی "جی نہیں۔ میں سادھنا نہیں ہوں۔ میرا نام شیلا سلوانی ہے۔"

آپ آٹو گراف بک ذرا سا اور آگے بڑھا کر اس کی طرف جھک کر کہیئے۔
"غضب کی مشابہت ہے آپ میں اور سادھنا میں۔"
پھر آپ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جائیے اور اس لڑکی سے کہیئے۔

"بلکہ میرے خیال میں تو آپ مس سادھنا سے زیادہ حسین ہیں۔ خوب صورتی اور دل کشی کے اعتبار سے چار نمبر آگے ہی ہوں گی۔ لائیے، اپنے ہاتھ سے اس آٹو گراف بک پہ دستخط کر دیجئے۔ آپ فلم میں کیوں نہیں جاتیں؟ کیا کرتی ہیں آپ؟ آپ کیئے چائے منگاؤں یا کافی یا آئس کریم؟ آپ کی پسندیدہ آئس کریم کونسی ہے؟ ایک دفعہ جو گفتگو شروع ہو گئی تو پھر تعارف ہی نہیں، تعارف سے آگے والا سلسلہ بھی چل نکلے گا۔ لڑکی کا بل خود ادا کیجئے۔ کسی خوب صورت لڑکی سے تعارف حاصل کرنے کے لئے اتنے مصارف تو برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔

یہ ترکیب مجھے پسند آئی تھی۔ اس فلم زدہ زمانے میں ہر حسین لڑکی اپنے آپ کو کسی مشہور فلم اداکارہ کا بدل سمجھتی ہے۔ کوئی اپنے کالج کی سائرہ بانو ہے کوئی اپنے گروپ کی وحیدہ رحمان ہے۔ کوئی اپنے محلے کی ببیتا ہے۔ اور جو اپنے علاقے میں زیادہ مشہور بھی نہیں ہے وہ بھی آئینہ دیکھ کر خود کو کسی نہ کسی فلمی

اداکارہ سے اپنا مقابلہ کیا کرتی ہے. چاہے مصنّف کی نگاہ میں اور آئینہ کی نظر میں اور آپ کے ذہن میں بھی دور دور تک اس کا کوئی شائبہ نہ ہو کہ آپ کی محبوبہ کی شکل فلاں اداکارہ سے ملتی ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں آپ صاف صاف جھوٹ بول جایئے۔ وہ اس تعریف کو ہضم کر جائے گی بلکہ تعریف کرنے والے کو نہ صرف مسرّت بھری بلکہ تعریفی نگاہوں سے دیکھے گی۔

پھر بھی مَیں نے یہ سوچا کہ اگر واقعی کوئی ایسی لڑکی مل جائے جس کی شکل و صورت سچ مچ کسی قدر فلمی اداکارہ سے مشابہت رکھتی ہو، تو میری غلط فہمی کے لئے ایک معقول جواز مل جائے گا۔ اور تعارف میں زیادہ آسانی رہے گی۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے جلد ہی کوالٹی رلیستوران کے ایک کونے میں ایک ایسی لڑکی مل گئی جو کسی قدر نئی فلمی اداکارہ کمد چگانی سے ملتی جلتی تھی۔ ایک ذرا سی جھلک، ایک ہلکی سی مشابہت، اور میرا کام بن گیا۔ وہ اس وقت تھی بھی اکیلی۔ ایک کونے میں ٹھنڈے دودھ میں کیلے کے قتلے ملا کر چمچہ ہلا رہی رہی تھی کہ مَیں نے اپنی جیب سے آٹوگراف بک نکالی اور خوشی سے غالباً پر تقریباً ٹہلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا، اور اس کی میز پہ جھک کر کہنے لگا، "معاف کیجئے۔ اگر مَیں غلطی نہیں کرتا تو آپ ہی کمد چگانی ہیں ــــــ مشہور فلمی اداکارہ"

وہ لڑکی اپنے گلاس میں چمچہ ہلاتے ہوئے مسکرانے لگی۔ مَیں نے سوچا تو آخر میرا کام آج بن ہی گیا۔ اب وہ اپنا اصلی نام بتلائے گی۔ اور اس کے آگے

جو کچھ ہو گا وہ میں نے مصنف کی کتاب سے ازبر کر ہی رکھا تھا۔

وہ آہستہ سے سر ہلا کر بولی، "جی ہاں! میں ہی کمد چگانی ہوں۔ شوٹنگ پر دلّی آئی تھی۔ تین گھنٹے کے بعد واپس بمبئی چلی جاؤں گی۔"

اس نے میری آٹوگراف بک واپس لے لی، اور اس پر دستخط کر دیئے۔

"یعنی کہ — یعنی کہ — آپ ہی — گویا کہ سچ مچ آپ ہی کمد چگانی ہیں؟"

میری زبان لڑکھڑانے لگی۔

"کیوں؟ کیا آپ کو کسی اور کا شبہ ہو رہا ہے؟" وہ پوچھنے لگی۔

"جی نہیں۔" میں اس کے سامنے کرسی اپنی طرف گھسیٹ کر بیٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے مجھے ٹوکتے ہی کہا، "معاف کیجئے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ چند لمحے تنہائی کے چاہتی ہوں۔"

"مگر ذرا سنیئے تو میرا نام ۔۔۔۔۔" میں نے ڈھٹائی سے کام لینا چاہا، کیوں کہ مصنف نے اس کی تلقین کی تھی۔۔

لیکن لڑکی نے میرا نام تک نہ سنا۔ بدستور اسی تلخ لہجے میں کہنے لگی، "اگر آپ اپنے آپ نہیں جائیں گے تو مجھے مینجر کو بلوانا پڑے گا۔" اتنا کہہ کر وہ پھر مسکرا دی اور میری آٹوگراف بک مجھے واپس کر دی۔

میں چپ چاپ یہ سوچتا ہوا اپنی ٹیبل پر واپس چلا آیا کہ مصنف کو اس ترکیب کو ذرا زیادہ تفصیل سے بیان کرنا چاہیئے تھا۔۔۔۔

ترکیب نمبر چار ۴۔ مصنف بیان کرتا ہے کہ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ لوگ یعنی سیلز مین لوگ گھروں میں صابن، ٹوتھ پیسٹ کے نمونے لے کر جاتے ہیں اور

اپنے خاص صابن یا ٹوتھ پیسٹ کی تعریف کے علاوہ صابن کی ایک چھوٹی سی ٹکیا، جس سے چھ ماہ کے چھوٹے بچے کا موہنہ بھی مشکل سے دُھل سکتا ہے نمونے کے طور پر گھر والی کو دے آتے ہیں۔ مصنّف نے دعوےٰ کیا ہے کہ اب تک سات ہزار نو سو اٹھتر عاشق اس ترکیب کو استعمال کر کے کامیابی سے ہمکنار ہو چکے ہیں۔ اس ترکیب کو آزمانے کے لیئے عاشق کو سیلز مین بننا پڑتا ہے۔ اور خود محبوب کے گھر جانا پڑتا ہے۔ آپ کو اس کے لیئے صرف یہ کرنا ہو گا۔ کہ ایک خاص قسم کا سیلز مین کا ڈریس سلوانا ہو گا، اور اس کے ساتھ اپنے بیگ میں میک اپ کا پورا سامان لے جانا ہو گا۔ فیس کریم، پاؤڈر، فونڈیشن اور وینشنگ کریم، روژ، وغیرہ وغیرہ۔ میک اپ کا مکمل سامان لے جائیے کسی مشہور میک اپ کمپنی کا سامان ہونا چاہئیے۔ اس میں خرچ تو ضرور ہو گا۔ کیوں کہ چھوٹے چھوٹے نمونے لے جانے کی بجائے آپ کو پورا اور اصلی سامان لے جانا پڑے گا۔ یہ سامان آپ اپنی محبوبہ کے حوالے کر دیجیئے، اور کہیئے۔

"آپ اسے مفت استعمال کر سکتی ہیں۔ اس کی لاگت بھی کمپنی نہ لے گی۔ البتہ ایک ہفتے یا (پانچ دن) کے بعد سیلز مین، یعنی بندہ پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گا۔ اور ہر پانچویں دن (یا ہفتہ میں ایک بار) حاضر ہو کر اس امر کا جائزہ لیتا رہے گا کہ موجودہ میک اپ سے آپ کو دوسرے میک اپ کے مقابلے میں زیادہ فائدہ ہو رہا ہے کہ نہیں۔ تسلی بخش نتائج کی صورت میں آپ کا سرٹیفکیٹ

حاصل کرے گی، جسے آپ کی تصویر کے ساتھ بڑے بڑے اخباروں میں چھاپا جائے گا۔۔۔"

مصنف نے اس ترکیب کی کامیابی سو فی صدی یقینی بیان کی ہے۔ یعنی یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ آپ کی محبوبہ میک اپ کے اس جال میں نہ آئے اور آپ کی تقدیر نہ کھل جائے۔

اس نئی ترکیب پہ میں نے بے حد محنت کی۔ ہلکے نیلے رنگ کی کیپ کے علاوہ ایک بش شرٹ اور پتلون سلوائی۔ کیپ اور بش شرٹ پر ایک چوکور خانے کے اندر "میکس فیکٹر" جلی اور ابھرے ہوئے حروف میں کڑھوایا۔ میک اپ کا سارا سامان اکٹھا کیا اپنے دفتر کے ایک دوست کی بیوی سے میک اپ کرنے کے طریقوں سے آگاہی حاصل کی۔ (چنانچہ دفتر میں یہ مشہور ہو گیا کہ میں جلد ہی کسی گاؤں کی لڑکی سے شادی کرنے والا ہوں، جسے میک اپ کرنا نہیں آتا۔)

اس ترکیب کے سیکھنے اور اس کے لئے تیاری کرنے میں پورا ایک ماہ لگ گیا۔ وردی پہ اسّی روپے خرچ ہوئے۔ دو سو روپے کا میک اپ کا سامان آیا۔ مگر اس عرصے میں کہیں بے کار نہیں گھوما۔ برابر اپنی محبوبہ کو ڈھونڈتا رہا ایسی جو حسین، نازک بدن، سیم تن، دل رُبا اور دل کش ہو۔ اور کہیں کسی فلیٹ میں اکیلی رہتی ہو۔ اور غیر شادی شدہ ہو۔

بے حد تلاش کے بعد مجھے ایک لڑکی مل ہی گئی۔ وہ ہر روز باتھو بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور کے ایک فلیٹ سے نکل کر صبح صبح دفتر جانے کے لئے اپنے بس

سے اڈّے پر آتی تھی۔ ہمیشہ اکیلی آتی تھی، اکیلی جاتی تھی۔ کبھی اس کو کسی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ رنگت میں صباحت، چال میں قیامت۔ قدم قدم پر آفت جگاتی تھی۔

اُسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا ــــــــ یہی ہے وہ ـــ۔ یہی ہے وہ ـــ۔

ایک سہ پہر کو میں نے اس کے دروازے کی گھنٹی بجائی تو وہ شوخ نارنجی رنگ کا ایک تپلا سا گون پہنے دروازے پر آئی۔ پہلے چند لمحے تو خاموشی میں گزرے کیوں کہ اس کے نارنجی گون سے اس کا سنہرا بدن چھن رہا تھا، اور میں اسے دیکھنے میں مبہوت تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کسی قدر تنک کر بولی،

"فرمائیے۔"

میں نے اپنے بیگ کی طرف اشارہ کر کے اُسے ذرا جھلاتے ہوئے کہا،

"میں آپ کے لئے میک اپ کا سامان لایا ہوں۔"

"مگر میں نے تو آپ کو میک اپ کے سامان کا آرڈر نہیں دیا تھا۔"

"جی ہاں! آپ درست فرما رہی ہیں۔ دراصل میری کمپنی نے مجھے آپ کے ہاں میک اپ کا سامان دے کر بھیجا ہے، تاکہ آپ اس کی مفت ٹرائی کر سکیں۔"

پہلے تو وہ کچھ جھجک رہی تھی۔ لفظ "مفت" پر چونکی۔ پھر اس نے میرے لئے دروازہ کھول دیا اور مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ میں بیگ کھول کر اسے سامان دکھانے لگا۔ جو واقعی بے حد بڑھیا تھا۔ اور اس گل بدن کے

گلاب جیسے کھلتے ہوئے لبوں سے خوشی کی ہلکی ہلکی سی آوازیں نکل رہی تھیں اور میں اس کے پتلے نائی لان کے نائٹ گون سے چھنتے ہوئے بدن کو دیکھ دیکھ کر اپنے جذبات میں ہیجان آتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

یکایک وہ سامان اٹھا کر ایک آئینے کے سامنے گئی، اور ہونٹوں پر لپ سٹک کی ٹرائی کرنے لگی۔ پھر بولی، مگر یہ لپ سٹک مجھے نہیں چاہیئے۔ اس کا رنگ بہت کھل رہا ہے۔ بہت سنجیدہ رنگ ہے یہ۔

"مجھے کوئی شوخ رنگ چاہیئے۔"

"دوسری لپ سٹک لے آؤں گا۔ کل ہی لے آؤں گا۔"

"اور آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ سارا سامان میک اپ کا میرے لئے ہے، اور میں اسے مفت حاصل کر سکتی ہوں؟"

"جی ہاں!"

"مگر اس سے کمپنی کو کیا فائدہ ہوگا۔"

"اگر یہ سامان آپ کو پسند آ گیا تو کمپنی آپ سے ایک سرٹیفکیٹ حاصل کرے گی اور اس سرٹیفکیٹ کو آپ کی تصویر کے ساتھ بڑے بڑے اخباروں میں جلی حروف کے ساتھ چھاپے گی۔"

"آپ کا نام؟"

"انورادھا"

"مجھے بنارسی داس کہتے ہیں۔"

"مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

"آپ کا نام آپ کے دل ہی کی طرح خوبصورت ہے۔"

میرے دل میں جسارت اور ہمت کی ترنگیں سی اُٹھنے لگیں۔ "اور یہ نارنجی رنگ کے شفّاف نائٹ گون میں آپ کا سنہرا بدن جامِ ارغوانی کی طرح جھلکتا ہوا۔۔۔"

"اے مسٹر، آپ حد سے آگے بڑھے جا رہے ہیں"۔ انورادھا ایک دم غصے سے بھڑک کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے۔ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں"۔ پھر انورادھا نے آواز دی۔

"ڈارلنگ!"

اندر کے کسی کمرے سے ایک نوجوان باہر نکلا۔ چھ فٹ اونچا، چوڑا چکلا سینہ۔ اس کا ایک ہاتھ پٹّی میں بندھا تھا۔ اور چہرے پر بھی دو جگہ نیل پڑے تھے اور ایک جگہ پلاسٹک کا کراس لگا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ مشہور باکسر شوراج تھا۔ جو آل انڈیا باکسنگ چیمپئن میں اسلم کیانی سے کل ہی ہارا تھا۔ مگر زخمی ہونے کے باوجود خاصا تگڑا دکھائی دے رہا تھا۔

انورادھا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا، "ڈارلنگ اس نے میری بے عزتی کی ہے۔"

میں نے جلدی سے بیگ سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ باکسر نے ایک مُکا میرے دائیں رخسار پہ مارا، دوسرا بائیں طرف۔ میں نے فرش پہ گرتے ہی اپنی کیپ اٹھائی تو انورادھا نے اپنی

چپل اُٹھائی۔ پھر یکایک میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ مکمل بلیک
آؤٹ۔۔۔۔

آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا۔ آج دو ماہ ہسپتال میں رہ کر میں باہر نکلا ہوں
اور سیدھا اس مصنف کے گھر جا رہا ہوں۔ جس نے لڑکیوں سے تعارف حاصل کرنے
کے باون طریقے لکھے ہیں۔

اگر کل کے اخبار میں آپ کسی مصنف کے قتل کئے جانے کی خبر پڑھیں تو
آپ کو ذرا بھی تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔

رونا

مثل مشہور ہے گانا اور رونا کسے نہیں آتا کہنے کو تو سچ ہے لیکن جہاں تک اسے کر دکھانے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس معاملے میں بالکل پھسڈی واقع ہوئے ہیں" ہم" سے مراد ساری انسانی برادری ہے کبھی آپ نے اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ جوں جوں ہم عمر میں بڑے ہوتے جاتے ہیں گانا تو خیر کبھی کبھی سن لیتے ہیں اور اگر کوئی قریب نہ ہو تو گا بھی لیتے ہیں جیسے کبھی کبھی نہانے کے کمرے میں یا کسی سنسان سڑک پر چلتے ہوئے لیکن رونا جو ہمارے بچپن کا ایک مرغوب و محبوب مشغلہ ہے اب پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ بڑے ہو کر اسے قریباً قریباً بھلا دیا جاتا ہے ابھی کل ہی میرے ایک دوست ذکر کر رہے تھے کہ آخری بار جب وہ روئے تھے، اس موقع کو اب قریباً دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے" اس دن میرے ایک قریبی دوست کی موت ہوئی تھی" پھر میری طرف دیکھ کر ایک آہ بھر کر کہنے لگے "آج کل نہ تو کوئی عزیز دوست مرتا ہے نہ ہی کسی رشتہ دار کی موت

ہوتی ہے تاکہ چار آنسو بہا کر جی ٹھنڈا کر لیا جائے۔ کبھی کبھی یونہی رونے کو جی چاہتا ہے لیکن پھر سوچتا ہوں، لوگ کیا کہیں گے۔

رونا کیوں اس قدر ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ ہر شریف انسان اسے برا سمجھتا ہے اور بزدلی کی نشانی۔ درحالیکہ رونا ایک فطری فعل ہے بلکہ انسان کا سب سے پہلا فطری فعل ہے اور اکثر حالتوں میں سب سے آخری بھی۔ گانا بے شک اچھی چیز ہے لیکن رونا اس سے ہزار درجہ بہتر۔ بچپن میں ہم گاتے کم تھے اور روتے بہت بچپن میں جب ہم روتے تھے۔ تو اکثر بار بار پچکارنے پر بھی چپ نہ ہوتے تھے بلکہ کئی لوگ پچکارتے بھی نہ تھے وہ کہتے تھے اچھا ہے تو ب روؤ رونا بچوں کے لئے مفید ہے۔ لیکن اب عجیب حالت ہے اگر کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو کر آبدیدہ ہو جائے تو لوگ اسے بزدل زنانہ مزاج، پست ہمت کہہ دیتے ہیں۔ اگر کسی بے چارے کی آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپک پڑیں یا ایک آدھ ہلکی چیخ بھی منہ سے نکل جائے تو اسے ہیجڑا کہہ دینے میں کوئی تامل نہیں آخر بات کیا ہے؟ ایک چیز جو بچوں کے لئے مفید ہے ان آدمیوں کے لئے جو اب بچے نہیں ہیں کیسے لئے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔

حکیم لوگ بتاتے ہیں کہ رونا بچوں کے لئے مفید ہے کیونکہ اس سے چھاتی کھلتی ہے۔ پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر آنکھ کی پتلیوں کو صاف کرتے ہیں ناک کے نتھنوں سے ریشہ جاری ہو کر باقاعدہ تنفس جاری ہوتا ہے رونے سے عضلات اور ریشوں کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔ الغرض رونا کشتی کرنے کے بعد دوسری بہترین ورزش ہے پھر اس سے محض بچے ہی کیوں فائدہ اٹھائیں۔ سوال ہے کہ کیا ہمیں چوڑی چھاتیوں اور مضبوط پھیپھڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے خیال میں اگر بچپن میں ان چیزوں کی ضرورت

تھی تو اب جوانی یا بڑھاپے میں تو اس کی ضرورت بہت شدید ہو جاتی ہے۔ غالباً بچوں کے دن رات رونے کی ہی وجہ سے تپ دق نہیں ہوتا اگر ہم لوگ بھی دن میں دو تین مرتبہ رو لیا کریں تو جہاں پھیپھڑے مضبوط ہوں وہاں نہ دمہ ہو نہ زکام آنکھوں کی بینائی بھی ٹھیک رہے کتنے بچے چشمہ لگاتے ہیں اور کون سا بوڑھا یا جوان ہے جو چشمے کی حاجت نہیں محسوس کرتا لوگ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے سدھ مکر دھوج، گولڈ پلز، ماءاللحم شربت فولاد استعمال کرتے ہیں لیکن اگر ان قیمتی دواؤں کی بجائے قدرت کے بیش ترین اصول برتیں اور دن میں صرف ایک آدھ گھنٹہ جی بھر کر رو لیا کریں تو جہاں جسم طاقت ور رہے وہاں دن بھر دل میں امن رہے گا اور وہ انتشار جو اس بیسویں صدی میں ہر فرد کے دل میں پایا جاتا ہے خود بخود مٹ جائے۔

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ رونا صحت کے لئے کس قدر مفید ہے۔ رونا جسم کی غذا ہے نہ صرف جسم بلکہ روح کی غذا بھی۔ ایسی مفید عادت کے لئے اور اسے بڑے پیمانے پر رائج کرنے کے لئے عالمگیر پروپیگنڈے کی ضرورت ہے اس کے لئے جگہ جگہ ادبی مجلسوں کی طرح رونے کی مجلسیں قائم کی جائیں۔ سکولوں اور کالجوں میں رونا لازمی مضمون قرار دیا جائے ایسی فلمیں دکھائی جائیں جہاں بڑے بڑے آدمی رو رہے ہوں۔ مثلاً ہٹلر، مسولینی، چیانگ کائی شیک۔ بڑے بڑے آدمیوں کو اس طرح دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھ کر عوام پر بہت اچھا اثر پڑے گا اور وہ بھی بے اختیار رونے لگ جائیں گے ذرا تصور کیجئے ایک بڑا سٹیڈیم ہال ہے جہاں ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے زور زور سے رو رہے ہیں۔ کتنا خوبصورت منظر ہے کیا یہ آپ کے شاعرانہ جذبات کو متحرک نہیں کرتا؟ یا پھر ہاکی، کشتی، فٹ بال کی طرح رونا بھی بطور ایک ورزش سکھایا جائے۔ ہر شام کو شہروں اور دیہاتوں کے قریب میدانوں میں

لاکھوں افراد کھڑے کئے جائیں جو چیخیں مار مار کر روئیں اور اپنی صحت کو بہتر بنائیں۔ اچھے اچھے رونے والوں کے ریکارڈ بھرے جائیں ملکہ موسیقی کی طرح ملکہ گریہ، رونے کا بادشاہ وغیرہ وغیرہ اس پروگرام کو مقبول بنانے کے لئے سینکڑوں طریقے برتے جا سکتے ہیں صرف نمونے کے لئے چند ایک یہاں درج کئے ہیں تاکہ سند رہے۔ باقی طریقوں کے لئے ڈیڑھ روپے کے ٹکٹ بھیج کر الراقم سے خط و کتابت کریں۔

رونے کی مختلف قسمیں ہیں بچوں کا رونا تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ لیکن بعض بچے بہادر اور دلیر ہوتے ہیں۔ وہ اکثر گھنٹوں کئی کئی دن روتے رہتے ہیں کھانا بھی کھاتے ہیں کھیلتے بھی ہیں اور درمیان میں ہچکیاں لے لے کر لگاتار روتے رہتے ہیں میں ایسے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ بڑے ہو کر یہ کیا نہ کر سکیں گے۔ یوں بھی تو بذات خود یہ کوئی کم کارنامہ ACHIEVEMENT نہیں اور میں تو اسے اتنی ہی اہمیت دیتا ہوں جتنی کہ واٹرلو کی لڑائی فرانس کے انقلاب اور سکندر کے حملے کو دی جا سکتی ہے۔

لڑکپن کا رونا ایسا ہے جیسے برسات کی بارش۔ ذرا استاد نے دو چار بید لگا دیئے تو رو رو کر جھڑی لگا دی۔ ادھر ماسٹر صاحب نے پچکارا۔ ادھر تبسم نما آفتاب نکل آیا۔ پل میں بارش۔ پل میں دھوپ لیکن ایک رونے پر ہی کیا موقوف ہے۔ لڑکپن میں ہر کام ایسا ہوتا ہے عجلت پسندی اور غیر مستحکم ارادوں کی۔ بس ان کا نام لڑکپن ہے۔ اور شباب تو اس سے بھی برا ہے اول تو لوگ جوان ہو کر روتے ہی نہیں۔ اگر روتے ہیں تو بہت کم اور اس جگہ جہاں کوئی نہ دیکھ پائے نہ سن سکے۔ جیسے کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہو رہے ہیں یونہی کبھی کبھی رسماً آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپکا دیئے جاتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی دبی ہوئی چیخ، لیکن شاذ و نادر۔

بڑھاپے میں بھی یہ لوگ روتے ہیں مگر اس طرح روتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے بھلا یہ بھی کوئی رونا ہے کہ ہو ہو ہو کر کے لبوں پر جھاگ لا کر آنسوؤں سے سفید داڑھی کو تر کر لیا جائے یہ رونا نہیں بلکہ رونے کی بھی ہنسی اڑانا ہے۔ دراصل داناؤں نے ٹھیک کہا ہے کہ بڑھاپے میں عقل ٹھکانے نہیں رہتی یوں بھی تو اس میں بوڑھوں کا کیا قصور ہے دراصل یہ لوگ عطائی ہوتے ہیں رونے کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں اگر رونا انہوں نے بطور فن یا ورزش کے سیکھا ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

رونا ایک فن ہے رونا ایک ورزش ہے رونا ایک آرٹ ہے موخر الذکر کو بچوں اور عورتوں نے خوب سمجھا ہے اور اپنایا ہے میں نے وہ بچے دیکھے ہیں جو اس طرح سسکیاں بھر بھر کر روتے ہیں کہ آدمی کا جی خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہے دل میں ترحم اور ہمدردی کا جذبہ عمیق موجزن ہو جاتا ہے اور وہ انہیں بازوؤں میں اٹھا کر پچکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور عورتیں! رونے کے آرٹ کو اگر دنیا میں کسی نے بہترین صورت میں پیش کیا ہے تو وہ عورت ہے عورت کے رونے نے ملکوں اور قوموں میں انقلاب پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک قلوپطرہ، ایک ہیلن ایک مسز ہمپنس، آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے ایک ملتجی نگاہ اور شاید آج دنیا کی تواریخ مختلف ہوتی اگر تاریخ کے ہر صفحے پر کسی عورت کے دو چار آنسو نہ ٹپکے پڑتے۔ یوں بھی عورت کے آنسوؤں کی بدولت کروڑوں گھروں میں ہر ساتویں دن ایک معاشرتی انقلاب آجاتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کمبخت مرد رونا نہیں جانتے اور عورتیں آنسو بہا کر ہمیں ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیتی ہیں وقت آگیا ہے کہ دنیا کے مرد اٹھیں اور اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس دام فریب کو پارہ پارہ کر دیا جائے کہ جس نے ہم غریب مردوں کو یوں جکڑ رکھا ہے اٹھو مجاہدو! اٹھو

سرفروشی کی تمنا وغیرہ وغیرہ کو یاد رکھیے ہماری آزادی کی بہتر صورت رونا ہے۔ خوب روؤ، جی بھر کر روؤ دن میں بار بار روؤ۔ اگر عورت کے چار آنسو دنیا میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں تو مرد کے آنسو کیا نہ کر سکیں گے۔

شیطان کا استعفیٰ

ایک روز شیطان خدا کے روبرو حاضر ہوا اور سر جھکا کر بولا "میرا استعفا حاضر ہے۔"
"کیوں کیا بات ہے؟" اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"میں اس کام سے عاجز آ گیا ہوں۔" شیطان نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا: ہر روز لوگوں کو جہنم کی آگ میں جلانا، لہو اور پیپ کے کڑاہوں میں ابالنا، چابک مار مار کر ان کی کھال ادھیڑنا، ہر لمحے لوگوں کو گناہوں پہ اکسانا، کتنا مشکل کام ہے میرا۔ اور جب سے دنیا بنی ہے جب سے یہ کام میں کر رہا ہوں، اور اب میں یہ کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ ذرا غور کیجیے بار الہا سب سے مشکل کام تو مجھے سونپا گیا ہے۔ ورنہ تیرے دوسرے فرشتے تو دن رات جنت کی ٹھنڈی ہوائیں کھاتے ہیں۔ تیری عبادت میں مگن رہتے ہیں اور ہر لحظہ لوگوں کو نیکی کا درس دیتے ہیں۔ کیا عمدہ و خوبصورت اور دلچسپ کام ہے ان کا۔ یا خدا، میرے مالک، میرے گاڈ، میرے بھگوان، رب عظیم! میں لوگوں کو گناہوں

پر اکساتے اکساتے تھک کر ٹوٹ چکا ہوں میرا استعفا قبول کر اور مجھے اس روز روز کے جہنم سے نجات دے۔"

یہ کہہ کر شیطان دو زانو ہو گیا اور خدا کے قدموں میں لیٹ کر گڑگڑا، گڑگڑا کر رونے لگا۔ خداوند کریم کے دل میں رحم آ گیا، انہوں نے اپنے فرشتوں اور ملائکہ سے مخاطب ہو کر پوچھا "کیا کہتے ہو تم لوگ!"

شیطان کی آہ و زاری سے فرشتوں کے دل پسیج چکے تھے مگر آگے بڑھ کر کچھ کہنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ آخر کار ڈرتے ڈرتے جبرائیلؑ نے اتنا کہا۔

"تو رحیم ہے، کریم ہے، واقعی شیطان کو اس کی گستاخی کی سزا مل چکی ہے، مجھے اس پر رحم آتا ہے۔"

خدا نے جبرائیل سے پوچھا۔ "کیا تم اس کی جگہ کام کرو گے ؟"

جبرائیل نے دست بستہ عرض کی "میں تیرا پیغام رساں ہوں۔"

میکائیل بولا۔ "میں روزی رساں ہوں۔"

اسرائیل بولا۔ "میں صور پھونکتا ہوں۔"

عزرائیل بولا۔ "میں روح قبض کرتا ہوں۔"

اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا جو روح قبض کرتا ہے اس کو ہم آج سے جہنم کی نگرانی پہ مقرر کرتے ہیں اور شیطان کو آزاد کرتے ہیں، اس کے پر اس کو واپس کر دو۔"

جب شیطان کو اس کے پر واپس مل گئے تو خدا نے اس سے کہا۔ "آج سے تو فرشتہ ہے۔ آج سے تو ہر ایک کو نیکی کا سبق دے گا۔ اس وقت تو سیدھا یہاں سے چلا جا موضع لکشمن نپن، جہاں کرم دین کسان کی لڑکی زہرا کا سودا ہو رہا ہے۔ جا کر فوراً اس
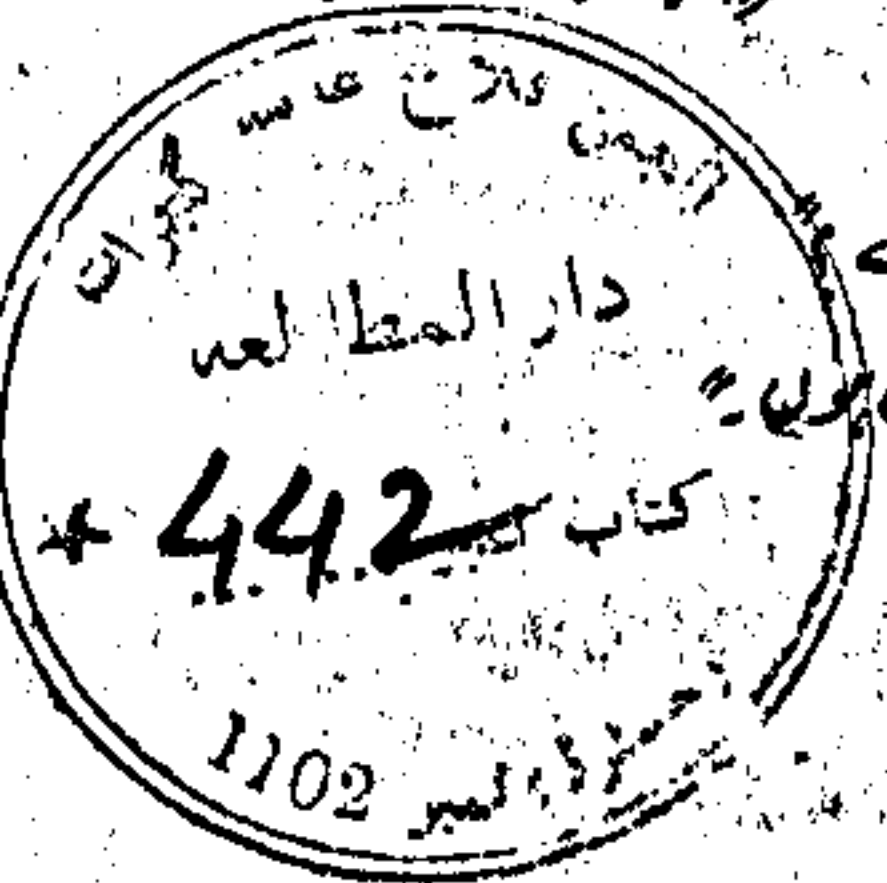
سودے کو روک دے۔"

شیطان نے ایک معمر سفید داڑھی والے بزرگ کا بھیس بدلا اور موقع تکشن تپن کرم دین کسان کے گھر پہنچ گیا اور اسے سمجھانے لگا۔ "اگر تم نے اپنی لڑکی بیچی تو تم پر خدا کا قہر نازل ہوگا۔"

"اس وقت تو بنیئے کا قہر نازل ہے۔" کرم دین مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر میں اپنی لڑکی نہ بیچوں تو زمین بیچوں گا اور اگر زمین بیچوں گا تو میں اور میری بیوی اور میری پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے کھائیں گے کہاں سے؟ تم نے یہاں کی زمین دیکھی ہے سخت اور پتھریلی اور بھربھری لال مٹی والی اس زمین میں مکا اور باجرے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ دن رات محنت کے بعد بھی ایک وقت فاقے سے گزرتا ہے اب اگر زمین بھی بیچ دیں گے تو سیدھے سیدھے مر جائیں گے۔ کیا تم پانچ لڑکیوں اور دو لڑکوں اور ایک بیوی کے قتل کے ذمہ دار بننے کے لئے تیار ہو؟"

شیطان نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔

"تو تم مجھے سمجھانے کی بجائے لالہ مصری شاہ کو سمجھاؤ جو ہمارے گاؤں کا بنیا ہے اور جس کا ساڑھے سات سو روپے کا قرضہ واجب الادا ہے، اگر وہ قرضہ مجھے معاف کر دے گا تو میں اپنی لڑکی زہرا کا سودا نہیں کروں گا۔"

شیطان نے اپنے ماتھے پر تلک کا نشان لگایا۔ گیروے رنگ کی ایک دھوتی پہنی کاندھے پر رام نام کا انگوچھا رکھا اور ہاتھ میں مالا لے کر لالہ مصری شاہ کے گھر پہنچ گیا لالہ مصری شاہ اس وقت اپنے گھر کے آنگن میں تلسی کی پوجا سے فارغ ہو کر کھاٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ شیطان نے آنکھ جگائی۔

اس کی بات سن کر لالہ مصری شاہ اپنے لہجے میں مصری گھولتے ہوئے بولے :"پنڈت جی آپ کیوں بار بار بھگوان کا نام لے کر مجھے ڈرا رہے ہیں۔ لڑکی کا سودا میں نہیں کر رہا ہوں۔ کرم دین کر رہا ہے۔ اس کی سزا جزا، گناہ و ثواب وہ بھگتے گا۔ میں کیا جانوں مجھے ساڑھے سات سو روپے چاہئیں۔ میرا قرضہ واپس کر دے۔ بس وہ جانے اس کا کام۔"

"لیکن اگر تم اس کے ساڑھے سات سو روپے معاف کر دو تو وہ اپنی لڑکی نہیں بیچے گا۔" شیطان نے اسے سمجھایا!

"کس کس کا قرضہ معاف کروں۔" بنیے نے اپنی لال کتاب اسے کھول کر دکھائی۔" یہ چوپڑی دیکھئے سندر داس سے دو ہزار لینے ہیں۔ جما سے پانچ سو ساٹھ روپے گوردیال سے آٹھ سو روپے اور مہتاب رائے تین ہزار کھائے بیٹھا ہے۔ اس گاؤں کے کسانوں پر میرا اکیس ہزار کا قرضہ مع سود کے نکلتا ہے۔ جب سب کو معاف کر دوں گا تو خود کھاؤں گا کہاں سے اور گھر کیسے چلاؤں گا؟"

"تم اور کسی کا قرضہ نہ معاف کرو صرف اُن کا کر دو جو تمہارے قرضے کی وجہ سے اپنی لڑکی کا سودا کرنے پر مجبور ہے۔"

"مجبور تو میں ہوں۔ میں نے دو پن چکیوں کے لائسنس کی درخواست دے رکھی ہے۔ اور مجھے اس لائسنس کے لئے ساڑھے سات سو روپے سات دن کے اندر اندر سرکاری خزانے میں داخل کرانا ہوگا کرم دین کسان کی زمین کی قرقی کے کاغذات میرے پاس ہیں اگر اس نے چار دن کے اندر اندر روپیا واپس نہ کیا تو میں اس کی زمین قرق کرا کے اپنے لائسنس کا روپیا بھر دوں گا۔"

شیطان نے بالا جیتے ہوئے کہا۔" تم کو شرم نہیں آتی لالہ مصری شاہ ان بچارے سو

روپیوں کے عوض تم ایک مسلمان لڑکی کو اپنے گھر میں لاؤ گے۔ اپنا دھرم بھرشٹ کرو گے؟"

"رام رام کیسی باتیں کرتے ہو پنڈت جی" لالہ مصری شاہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "میں ایسی قبیح حرکت کو تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لڑکی کو میں اپنے گھر نہیں لا رہا ہوں۔ اصل میں اس لڑکی کا سودا خواجہ بدرالدین سے ہو رہا تھا جو لکشمن تین کے پل پار آڑھت کی دکان کرتا ہے اس کی چار بیویاں پہلے سے موجود ہیں، مگر اس پر بھی زہرا کے لئے ساڑھے سات سو دینے کے لئے تیار ہے۔ سودا صرف اتنا ہے کہ کرم دین ساڑھے سات سو کے عوض خواجہ بدرالدین کو اپنی لڑکی اور کرم دین اپنے قرضے کے عوض ساڑھے سات سو مجھے دے گا اور میں اپنے لائسنس کے عوض۔"

"بس بس" شیطان گھبرا کر بولا "یہ بتاؤ کیا یہ گندہ سودا کسی طرح رک نہیں سکتا؟"

"خواجہ بدرالدین چاہے تو رک سکتا ہے۔ اس کو پانچویں شادی کرنے کی ضرورت کیا ہے چار تو اس کے گھر میں پہلے سے موجود ہیں وہ اگر شادی نہ کرے تو یہ سودا آسانی سے رک سکتا ہے۔"

"مگر میں کہاں پانچویں شادی کر رہا ہوں؟"

خواجہ بدرالدین آڑھتی نے شیطان کو سمجھایا۔

"یہ درست ہے کہ میری چار بیویاں ہیں، مگر سب سے پہلی عمر رسیدہ ہو چکی ہے گھر کا کام تک نہیں کر سکتی میں اس کا مہر ادا کر کے اس کا خرچہ باندھ کے اس کو الگ کر دوں گا اور تب زہرا سے شادی کر دوں گا۔"

"مگر تمہاری عمر پینسٹھ برس کی ہو چکی ہے اس بڑھاپے میں تم کیوں شادی کرنا چاہتے ہو؟" شیطان نے اس سے پوچھا۔

"چار بیویوں سے آج تک کوئی لڑکا پیدا نہیں ہُوا سب ہی لڑکیاں جنتی ہیں"
خواجہ بدرالدین مایوسی سے بولا "مجھے لڑکا چاہیئے اپنا نام لیوا۔ خاندان چلانے والا ـــ"

"یہ ضروری نہیں ہے کہ زہرا سے لڑکا ہی پیدا ہو" شیطان نے کہا۔ "اللہ بڑا کارساز ہے" خواجہ بدرالدین نے ہاتھ اوپر اٹھا کے کہا: "وہ مجھے ضرور میری مُراد دے گا۔

شیطان نے پھر پوچھا "کیا کسی طرح یہ سودا نہیں رُک سکتا؟"

"کیوں۔ زبردستی کا سودا تو ہے نہیں جناب"

خواجہ بدرالدین نے کسی قدر تلخی سے کہا "لڑکی بالغ اور جوان ہے اپنا بُرا بھلا خود سوچ سکتی ہے۔ اگر لڑکی اس شادی کے لئے راضی نہ ہو تو میں یا اس کا باپ اسے شادی کے لئے کبھی مجبور کر سکتے ہیں؟"

شیطان نے ایک خوب رو گبرو کا بھیس بدلا اور زہرا سے ملنے چلا گیا جو اس وقت بکی ڈھکی کی بیریوں کے سائے میں ایک ٹھنڈے چشمے کے کنارے بیٹھی ہوئی گھڑا بھر رہی تھی، پہلی، نظر میں ہی وہ اس گبرو نوجوان پہ عاشق ہو گئی، اس کے سنہری گالوں پر حیا کی گلابی رنگت بکھر گئی اور وہ لجا کر چشمے میں پڑے ہوئے گھڑے کو اپنی انگلیوں سے گھمانے لگی۔

شیطان نے اسے شادی کا پیغام دیا۔

زہرا گھڑا گھماتے رُک گئی۔ نظر بھر کر اس نے نوجوان کی طرف دیکھا، پھر اس نے اپنی آنکھیں جھکائیں اور بڑی کمزور آواز میں بولی۔

"کیا کام کرتے ہو؟"

"کچھ نہیں کرتا۔" شیطان بولا۔ "خدا کا نام لیتا ہوں!"

"خدا کا نام تو سب ہی لیتے ہیں۔" زہرا اُداس ہو کر بولی۔ "پھر تم مجھے کھلاؤ گے کیسے؟"

"ہم دونوں ہل کر محنت کریں گے!"

"محنت تو میں نے ہمیشہ کی ہے۔ اپنے ماں باپ کے گھر میں اور کھیتوں میں۔ آج تک دن رات محنت کرتی آئی ہوں اور اس محنت نے مجھے پھٹے چیتھڑے اور ایک وقت کا فاقہ دیا اس محنت سے اب عاجز آ چکی ہوں۔"

شیطان دیر تک چُپ رہا۔ پھر آہستہ سے بولا!

"زہرا تم جوان اور خوبصورت ہو ذرا سوچو تو تم اس پینسٹھ برس کے بڈھے سے شادی کر کے خوش رہ سکو گی۔ کیا تمہاری روح کو اس امر سے اطمینان ہو گا کہ تم ایک انسان ہو کر چاندی کے سکوں کے عوض فروخت کی جا رہی ہو؟"

"وہ مجھے گھر دے گا، دو وقت پیٹ بھر کے روٹی تو دے گا۔" زہرا کا چہرہ امید سے کھل گیا۔

"مگر وہ بڈھا بدصورت پینسٹھ برس کا ــــ!"

شیطان نے زہرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "ذرا سوچو تم اس سے کیسے خوش رہ سکو گی؟"

زہرا نے آہستہ آہستہ اپنی لابنی لابنی پلکیں اوپر اٹھائیں اور تنہر یز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "خوش ہونے کے لئے میں کبھی کبھی تم سے مل لیا کروں گی آؤ گے نا مجھ سے ملنے کے لئے چھپ کے؟"

زہرا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے اپنا سینہ اس کے سینے پر رکھ دینا چاہا،

مگر شیدطان جلدی سے ہاتھ چھڑا کے بھاگ گیا۔

وہ تھانے دار گوردیال سنگھ کے پاس پہنچا اور اس سے کہنے لگا "میں ایک شریف شہری کی حیثیت سے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس سودے کو روک دیجئے اور ایک لڑکی کی زندگی تباہ ہونے سے بچا لیجئے۔ تھانے دار صاحب! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ موضع گلشن پتن کا کسان کرم دین اپنی لڑکی کا سودا خواجہ بدرالدین سے کر رہا ہے۔ ساڑھے سات سو روپے لے کر وہ اپنی لڑکی کی شادی خواجہ بدرالدین سے کر دے گا اور زہرا کو پاکر خواجہ بدرالدین ساڑھے سات سو روپے کرم دین کو دے گا جو یہ ساڑھے سات سو روپے لے کر لالہ مصری شاہ کو دے کر اپنی زمین چھڑا لے گا کیا انسان کی روح اب مولیوں اور بینگنوں کی صورت میں بیچی جائے گی۔ اخلاقی اعتبار سے یہ سودا غلط ہے مذہبی اعتبار سے یہ گناہ عظیم ہے۔ قانونی اعتبار سے بھی یہ جرم ہے۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں آپ اس علاقے کے تھانے دار ہیں آپ اس خلاف قانون سودے کو روک دیجئے۔"

"میں ہرگز نہیں روکوں گا" تھانے دار نے شیدطان کو سمجھایا "مجھے سارا قصہ معلوم ہو چکا ہے اور میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے مجھے معلوم ہے کہ جب زہرا کا نکاح خواجہ بدرالدین سے ہوگا، اس سے چند منٹ قبل خواجہ بدرالدین ساڑھے سات سو روپے اپنے ہاتھ سے اپنی ہونے والی بیوی کے ہاتھ میں دے گا۔ زہرا وہ رقم لے کر اپنے باپ کے ہاتھ میں دے گی۔ نکاح کے بعد وہی رقم لے کر کرم دین لالہ مصری کے پاس جائے گا اور وہی ساڑھے سات سو روپے دے کر اپنا قرضہ چکائے گا، مگر میرے آدمی خواجہ بدرالدین کے نکاح کے وقت موجود ہوں گے، اور جو روپیا خواجہ بدرالدین اس سودے کے عوض دے گا اس پر پہلے سے ہمارے خفیہ نشان بنے ہوں گے پس جب

نکاح ہو جائے گا تو میں ایک ہی ہلے میں سب کو گرفتار کر دوں گا اور ان پر دختر فروشی کے سلسلے میں مقدمہ چلاؤں گا۔"

"مگر آپ مقدمہ کیوں چلاتے ہیں۔" شیطان نے پریشان ہو کر کہا "آپ اس خلاف قانون حرکت کو عمل میں آنے سے پہلے ہی کیوں نہیں روک دیتے؟"

"بڑے چغد ہیں آپ!" گوردیال سنگھ تھانیدار نے جھلا کر کہا: "میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اتنے بڑے مقدمے کو یوں آسانی سے ہاتھ سے جانے دوں جس میں خواجہ بدرالدین اور مصری شاہ اور کرم دین اور زہرا کو میں ساتھ لپیٹ میں لے سکوں۔ خواجہ بدرالدین سے میں کم از کم دو ہزار روپے رشوت میں لے لوں گا اور اتنی ہی رقم لالہ مصری شاہ سے اینٹھ لوں گا، پھر میں نے سنا ہے زہرا بہت خوبصورت لڑکی ہے۔"

"مگر یہ تو گناہ ہے۔" شیطان نے گھبرا کر کہا۔

"ان چار ہزار روپوں سے میں اپنی لڑکی کی شادی کر سکوں گا۔ بڑی بچی کی شادی ایک عرصے سے رکی ہوئی ہے۔ مجھے اس کے جہیز کے لئے معقول رقم چاہیئے، اب ایک ہی ہلے میں سب بندوبست ہو جائے گا۔"

"ایک لڑکی کی شادی کے لئے آپ دوسری لڑکی کی زندگی تباہ کریں گے۔ یہ تو پاپ ہے۔"

"اور شہرت الگ ملے گی جناب!" تھانیدار نے شیطان کو سمجھایا: "اتنا بڑا مقدمہ آج تک اس علاقے میں کسی تھانیدار کے ہتھے نہ چڑھا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس مقدمے کی کامیابی کے بعد میں انسپکٹر بنا دیا جاؤں۔"

"یہ تو جرم ہے۔" شیطان چلایا۔

"آپ بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہیں!" تھانیدار نے گرج کر پوچھا۔

"میں خدا کا بندہ ہوں۔" شیطان نے عاجزی سے سر جھکا کر کہا۔ "لوگوں کو نیکی کا درس دیتا ہوں۔"

تھانے دار نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ سات دن کے بعد حوالات سے چھوٹ کر شیطان خدا کے حضور میں پہنچا اور اپنے پر واپس کرنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" اللہ تعالےٰ نے پوچھا۔

شیطان نے کہا۔ "میں نے سوچا تھا کہ میرا کام سب سے مشکل ہے، اور فرشتوں کا کام سب سے آسان ہے۔ اب معلوم ہوا کہ میرا کام آسان ہے، اور فرشتوں کا کام سب سے مشکل ہے اس لئے میں اپنا استعفا واپس لیتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ مجھے فوراً جہنم پر بھیج دیا جائے۔

ہیر رانجھا

ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا بالکونی کے قریب کتاب پڑھ رہا تھا ہلکی بارش ہو رہی جھکڑ بھی چل رہے تھے اور بہت خوش گوار سماں تھا میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ یکایک بجلی کا ایک زور کا کوندا لپکا اور میرے دروازے کے پٹ کھل گئے کیا دیکھتا ہوں کہ ــــ

د ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت، دونوں پانی میں بھیگے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہیں کمرے میں اندھیرا ہے، آوازیں سنائی دیتی ہیں، صورت نظر نہیں آتی)

رانجھا:۔ ہیر بیبے! شکر ہے کہ اس کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔
نہیں تو بارش اور جھکڑ سے بھیگ جاتے۔

ہیر:۔ یہ کس کا کمرہ ہے رانجھا؟

رانجھا:۔ کسی کا بھی ہیر بیبے! اپنے کو کیا لینا۔ ذرا پل کی پل رُک جائیں بارش ختم

ہو جائے گی تو چلے جائیں گے۔

ہیر :۔ کہاں

رانجھا :۔ وہیں فٹ پاتھ پر۔

ہیر :۔ رانجھے! میں اسی لئے تم سے کہتی تھی اپنا گارڈن چھوڑ کر بمبئی مت چلو۔

رانجھا :۔ میرے گاؤں میں سب میرے دشمن ہیں کوئی مجھے نہیں چاہتا، تیرے سوا، وہاں اگر ہم رہتے تو ہماری محبت کبھی زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔

ہیر :۔ لیکن وہاں دو وقت روٹی تو ملتی تھی اور لسّی بھرا چھنّا اور مکھن سے بھرا ہوا کٹورہ اور سرسوں کا ساگ اور کھلی فضا اور تم کبھی جوگی بن کر میرے پاس آجاتے تو میرے دل کے ہر کونے میں رنگین تتلیاں سی اڑنے لگتی تھیں۔

رانجھا :۔ اور آج چوہے دوڑ رہے ہیں پیٹ میں وہنس کر) سچ سچ ہیر بے لسّی پیئے تو ایک عرصہ ہو گیا۔ سرسوں کا ساگ کھائے ہوئے کئی سال ہو گئے اور مکھن یعنی مسکہ تو یہاں کھایا نہیں جاتا۔ صرف خوشامد میں لگایا جاتا ہے یاد ہے جب ہم پہلے دن اس شہر میں آئے تھے اور اس سے لسّی بنانے کو کہا تھا۔ اس نے پوچھا تھا لسّی کتنے دہی کی بناؤں۔ میں نے کہا تھا اس برتن میں جتنا دہی ہے۔ سب کی بنا دو۔

ہیر :۔ اور وہ حلوائی یہ سنتے ہی غش کھا کر گر گیا تھا۔

(دونوں ہنستے ہیں)

ہیر :۔ یہاں اندھیرا بہت ہے رانجھا۔

رانجھا :۔ دیکھتا ہوں بتی بجلی کہیں ہو گی (سوئچ دبا کر) لو روشنی ہو گئی۔

ہیر :۔ یہ بجلی بھی خوب چیز ہے رانجھا! بٹن دباؤ اور روشنی ہو جاتی ہے۔ ہمارے

زمانے میں بجلی نہیں تھی۔

رانجھا:۔ لیکن ہمارے زمانے میں بٹن دبانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی ہم ایک لمحے میں تیرے رُخ روشن سے دل میں اُجالا کر لیتے تھے۔ پھر اس روشنی پہ کوئی ٹیکس بھی تو نہیں دینا پڑتا تھا۔

ہیر:۔ رانجھا! مجھے بھوک لگی ہے۔

رانجھا:۔ تین دن سے میں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔

تین دن سے ایسی لگاتار بارش ہو رہی ہے کہ کسی کام پہ بھی نہیں جا سکتا۔ اس بارش کی وجہ سے بلڈنگ باندھنے کا کام بند ہے پہلے اینٹیں ڈھونے کی مزدوری تو مل جاتی تھی، اب وہ بھی بند ہے۔

ہیر:۔ غریب آدمی بارش میں کیا کرتے ہوں گے۔؟

رانجھا:۔ ہماری طرح بارش میں بھیگتے ہوں گے۔

ہیر:۔ بڑی مصیبت ہے رانجھے!

رانجھا:۔ مصیبت تو ہے لیکن ہمت کرو تو بڑی سے بڑی مصیبت بھی کٹ جاتی ہے۔ ارے ہاں —— میں تو تم سے پوچھنا بھول گیا تم اس فلم کمپنی میں گئی تھیں؟

ہیر:۔ کس فلم کمپنی میں؟

رانجھا:۔ وہ جہاں رانجھے کا فلم بن رہا ہے۔ یعنی اپنی محبت کی کہانی!

ہیر:۔ ہاں گئی تھی!

رانجھا:۔ ڈائریکٹر سے ملی تھیں؟

ہیر:۔ ہاں ملی تھی۔

رانجھا :- پھر ۔۔۔ ؟

ہیر :- وہ تو بہت ہی عجیب آدمی معلوم ہوتا ہے۔ وہاں تو سب کے سب بہت سے عجیب آدمی بیٹھے تھے۔ میں اندر داخل ہوئی تو مجھے ایسے گھورنے لگے جیسے گوالا بھوری بھینس کو گھورتا ہے۔

ڈائریکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

یکایک ہیر گھوم کر اپنے زینے کے مرکزی پردے کی طرف چلنے لگتی ہے پردے کے قریب پہنچتے ہی پردہ اُٹھ جاتا ہے سامنے فلم کمپنی کا دفتر نظر آتا ہے۔ چھ سات آدمی ٹوٹے ہوئے پیالوں میں چائے پی رہے ہیں بیچ کی میز پر ایک فلم ڈائریکٹر بیٹھا ہے اس نے آوارہ ٹائپ کی پتلون اور گہرے زرد رنگ کی بش شرٹ پہن رکھی تھی صورت سے وہ فلم ڈائریکٹر کم۔ دارا سنگھ پہلوان کا اسسٹنٹ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔)

فلم ڈائریکٹر :- صاحب کو ایک سنگل چائے مارو (دوسرے آدمی سے) ہاں بھئی شرما جی! آج فنانسر کے پاس جانا ہے اس احمق نے آج ڈیڑھ لاکھ روپے دینے کا وعدہ تو کیا ہے۔ ایک چونی ہے تمہاری جیب میں اس چائے والے کو دے دو۔

(وہ آدمی چائے والے کو چونی دیتا ہے)

چائے والا :- (دیکھ کر) مگر یہ چونی تو کھوٹی ہے۔

ڈائریکٹر :- کوئی بات نہیں۔ کل سے جانا اور ہاں بھئی شرما جی! وہ فلم کے نگیٹو کا کیا بند و بست ہو گا؟

شرما جی :- کل ہو جائے گا۔ بچو بھائی، سیٹھ اگر بھوندو بھائی سے کہہ دے گا تو کام ہو جائے گا۔

ڈائریکٹر :۔ مگر بچو بھائی کیوں کہے گا۔؟

ثریا :۔ ان کا راستہ بھی ڈھونڈ لیا ہے وہ ہے ناچتی سائڈ ہیروئن مدھر بالا۔

(سب لوگ قہقہے لگاتے ہیں۔ ڈائریکٹر میز کے سامنے کھڑی ہیر کی طرف مخاطب ہوتا ہے)

ڈائریکٹر :۔ کیا کام ہے تم کو ؟

ہیر :۔ پٹاخہ فلم کمپنی کا دفتر یہی ہے ؟

ڈائریکٹر :۔ ہاں ہاں یہی ہے۔ پھر؟

ہیر :۔ سنا ہے کہ آپ ہیر رانجھا فلم بنا رہے ہیں۔

ڈائریکٹر :۔ ہاں ہاں بنا رہے ہیں۔ پھر؟

ہیر :۔ میں اس فلم میں کام کرنے آئی ہوں۔

ڈائریکٹر :۔ تم کو کیا کام آتا ہے ؟ کبھی کسی فلم میں کام کیا ہے ؟

ہیر :۔ نہیں۔

ڈائریکٹر :۔ تم کو ناچنا آتا ہے ؟

ہیر :۔ نہیں۔ لیکن ناچنے کی کیا ضرورت ہے ؟ ہیر تو نہیں ناچتی تھی۔

ڈائریکٹر :۔ تم کو کیسے معلوم۔ نہیں ناچتی تھی۔ ہماری فلم میں تو وہ ناچتی ہے۔ کتھک، رمبا سمبھا، سب ہی ناچتی ہے۔

ہیر :۔ اس زمانے میں رمبا سمبھا نہیں تھا۔!

ڈائریکٹر :۔ تم کو کیا معلوم ہے ؟ ہمارا رائٹر کیا گدھا ہے پھر؟ اس نے دس کتاب دیکھ کر کہانی لکھا ہے اچھا یہ بات چھوڑو۔ ہم تم سے مغز پچی نہیں کرے گا۔ تم کو اس فلم

میں کام کرنا ہے، ہم تم کو اس فلم میں ہیر کی ماں کا پارٹ دے گا۔ بولو منظور ہے ؟

ہیر:۔ ہیر کی ماں ؟ مگر میں —— میں ہیر کی ماں کا پارٹ کیسے کر سکتی ہوں ؟

ڈائریکٹر:۔ کیوں ؟

ہیر:۔ کیونکہ میں خود ہیر ہوں۔

ڈائریکٹر:۔ ہیر۔ ہا ہا ہا! او گمت بھائی، سدھاکر، بلی موریا، محمود خاں! ارے دیکھو، خود ہیر تمہاری فلم میں کام کرنے آئی ہے۔ اس کی صحت دیکھو، شکل دیکھو رنگ روپ دیکھو۔ ارے یہ ہیر معلوم ہوتی ہے! ہیر۔ ... ... !

(قہقہہ)

ہیر:۔ ہاں ڈائریکٹر صاحب! سچ مچ میں ہیر ہوں ہیر۔ وارث شاہ کی ہیر، پانچ دریاؤں کی سرزمین کی ہیر، محبت اور حسن کے لازوال گیتوں کی حسین تعبیر۔

ڈائریکٹر اور اس کے ساتھیوں کے قہقہے بڑھتے جاتے ہیں۔ ہیر کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے چپ چاپ رانجھے کی طرف دیکھ رہی ہے۔

رانجھا:۔ (آبدیدہ ہو کر) وہ لوگ تمہارے حسن کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہیر کے حسن کو کوئی رانجھا ہی دیکھ سکتا ہے (ہیر سسکیاں لیتی ہے رانجھا اس کے قریب آ جاتا ہے)

رانجھا:۔ وہ لوگ محبت کرنے والے نہیں ہیں۔ محبت کو ایک فیتے کی طرح لپیٹ کر بازار میں بیچنے والے ہیں بس اپنے آنسو پونچھ ڈال۔

ہیر:۔ سچ کہتی ہوں رانجھا! مجھے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ اب صبر نہیں ہو سکتا یہاں تو سب کاغذ ہی کاغذ ہیں یہ کوئی بھوکا وکیل معلوم ہوتا ہے۔

(کھڑبڑ کی آواز)

رانجھا :۔ مل گیا! آخر کچھ کھانے کو مل گیا۔!

ہیر :۔ کیا ہے ؟

رانجھا :۔ ڈبل روٹی جسے بمبئی کے لوگ پاؤ کہتے ہیں ۔ حالانکہ وزن میں ایک چھٹانک بھی نہیں۔

ہیر: مجھے دو!

رانجھا :۔ ہیریے ! ذرا ٹھہر!

ہیر :۔ جلدی سے دو جلدی (روٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے)

رانجھا :۔ ذرا ٹھہر ہیریے ۔ ذرا سوچنے دے ہیریے ! یہ تو جانتی ہے کہ ہم یہاں صرف بارش سے پناہ لینے کے لئے آئے ہیں ۔

ہیر :۔ ہاں ! لیکن یہ ڈبل روٹی ؟

(روٹی کی طرف بیقراری سے بڑھتی ہے رانجھا پیچھے ہٹ جاتا ہے ۔)

ہیر :۔ لیکن یہ روٹی جلدی سے دے دے میں تین دن سے بھوکی ہوں ۔

رانجھا :۔ لیکن یہ چوری ہو گی ہیریے ! اگر ہم یہ ڈبل روٹی کھائیں گے تو یہ چوری ہو گی ۔

ہیر :۔ لیکن مجھے تو سخت بھوک لگی ہے رانجھا !

رانجھا :۔ تجھے میری محبت کی قسم ہیریے یہ روٹی نہ کھا !

ہیر :۔ اب میں کوئی قسم نہیں کھاؤں گی رانجھیا ! میں تو صرف روٹی کھاؤں گی۔ جلدی سے یہ روٹی دے دے ! (ہیر آگے بڑھ کر روٹی چھین لیتا ہے)

رانجھا :۔ نہیں نہیں ہیریے ! دیکھ وہ سامنے ہم دونوں کی تصویر لگی ہے ۔ کوئی

بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے آج بھی، بھوک، بیکاری اور خود غرضی کے زمانے میں اس نے ہماری تصویر لگا رکھی ہے دیکھ یہ آدمی کتنی عزت کرتا ہے ہماری محبت کی! اس کے گھر میں چوری نہیں کریں گے۔ لا مجھے روٹی واپس دے دے! میں اُسے اسی دراز میں رکھے دیتا ہوں جہاں سے اسے اٹھایا تھا۔

(ہیر کبھی روٹی کو، کبھی دیوار سے لگی تصویر کو دیکھتی ہے۔ آخر میں روٹی کو واپس کر دیتی ہے۔ رانجھا میز کی دراز کھول کر اس میں روٹی رکھ دیتا ہے ہیر سسکیاں لیتی ہے)

رانجھا:۔ نہ رو ہیریے! میری اپنی ہیریے! یہ بارش تھم جائے گی پھر مجھے کہیں نہ کہیں کام مل جائے گا۔ پھر ہم دونوں پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گے۔

(بارش اور طوفان کی آواز باہر سے آتی ہے کھڑکیاں اور دیواریں بجنے لگتی ہیں)

ہیر: یہ بارش کبھی نہیں تھمے گی۔ یہ طوفان کبھی نہیں ختم ہوگا۔ ہم سدا بھوکے رہیں گے۔

رانجھا:۔ نہیں! ایک دن یہ بارش تھم جائے گی۔ ایک دن یہ طوفان ختم ہو جائے گا۔ ایک دن یہ بادل چھٹ جائیں گے اور سورج کی روشنی ساری زمین کے سارے آنسو چوس لے گی اس دن کوئی بھوکا نہ ہوگا کوئی ڈبل روٹی نہیں چرائے گا۔ اس دن ساری محبتیں مکمل ہو جائیں گی۔

(دونوں دروازے کی طرف چلنے لگتے ہیں۔ روشنی کی ایک کرن بالکنی سے بڑھتے ہوئے دیوار پہ لگی ہوئی ہیر رانجھے کی تصویر کے گرد ہالہ بنا دیتی ہے) (پردہ)

گواہ

مرحوم کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟

مرحوم! حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مرحوم کا نام کیا تھا؟

مرحوم کا نام رام بھجا۔ خدا بخش۔ گوردیال سنگھ۔ انیتی لال۔ ابراہیم، تانگ پاؤر۔ کرنکن تھا۔ لیکن مرحوم مرتے وقت صرف مرحوم ہو کر رہ گئے تھے۔

مرحوم کی عمر کیا تھی؟

مرحوم بچوں میں بچے۔ جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بیٹھ کر بوڑھے بن جاتے تھے۔ اس لئے آج تک ان کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا۔ ہاں قیاس غالب ہے کہ مرحوم کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے بے وقت چھین لیا۔ ورنہ مرنے کی ان کی عمر نہ تھی۔ مرحوم کی عمر کے متعلق اس سے زیادہ کسی کو

معلوم نہیں۔

مرحوم کے اوصاف و فضائل بیان کرو؟

مرحوم کے اوصاف "حسنہ" اور فضائل "حمیدہ" تھے۔ اس کے علاوہ وہ "فرشتہ سیرت"۔ "نیک طینت"۔ اور "مرنجان مرنج" بھی تھے۔ قدرت نے انہیں "ادبی ذوق" سے متصف کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ فلک کج رفتار نے۔۔۔۔۔

اچھا۔ اچھا۔ اب یہ بتاؤ کہ مرحوم کا حلیہ کیا تھا۔

مرحوم بڑے گورے چٹے۔ وجیہہ۔ دوہرے بدن کے آدمی تھے۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں مرحوم ایسا خوبصورت بچہ سارے شہر میں نہ تھا۔ جوانی میں مرحوم ایسا گبھرو جوان چراغ لے کر ڈھونڈھے سے نہ ملتا تھا۔ بڑھاپے میں ان کے چہرے پر ایسا نور برستا تھا کہ ان کی طرف دیکھنا بھی محال ہو چکا تھا۔ مرتے وقت لوگ دوربین یا خوردبین لگا کر دیکھتے تھے۔ جلال کا یہ عالم تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم کا چہرہ سنولایا ہوا تھا بلکہ سیاہ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ اور چہرہ کتابی تھا۔ جس سے فطری ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔

مرحوم کا باطن کیسا تھا؟

مرحوم کے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔

مرحوم کہاں رہتے تھے؟

مرحوم اسی کرۂ ارض پر رہتے تھے لیکن جب مر گئے تو غالباً آنجہانی ہو گئے

مرحوم کی عادات کے بارے میں تم کچھ کہہ سکتے ہو؟

مرحوم بڑے وضع دار تھے۔ وضعداری کو نبھاتے نبھاتے مرحوم ہو گئے۔ مرحوم بچوں اور جوانوں سے بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے تھے اور بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔ لیکن ان میں خود داری بہت تھی۔ اس لئے کبھی گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ مرحوم بڑے فیاض تھے لیکن افسوس کہ غریبی نے ان کے اس جوہر کو پنپنے نہ دیا۔ پھر بھی وہ اپنی ہی کر گزرتے تھے۔ مرحوم جھونپڑے میں رہتے تھے بنگلے میں رہتے تھے۔ محل میں رہتے تھے، لیکن جہاں کہیں بھی وہ رہتے تھے ہمیشہ خدا کو یاد کرتے تھے۔ مرحوم بڑے خوش گفتار تھے۔

خوش گفتار؟

جی ہاں۔ جب مرحوم بات کرتے تھے تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔

کیا انہوں نے اپنے منہ کے اندر پھولوں کے گلے چھپا رکھے تھے؟

جی ہاں! اور اس کے علاوہ جب وہ ہنستے تھے تو موتی برستے تھے۔

آپ نے کتنے موتی چنے؟

ہزاروں! لاکھوں!

تو پھر تو آپ بہت امیر بن گئے ہوں گے۔ کتنا انکم ٹیکس دیتے ہیں آپ!

جی کچھ بھی نہیں۔ وہ سارے موتی میں نے ہار میں پرو کر مرحوم کی قبر پہ چڑھا دیئے۔

اچھا تو کیا وہ دفنائے گئے تھے؟

جی ہاں! وہ دفنائے گئے تھے۔ جلائے گئے تھے۔ بہائے گئے تھے پھانسی پہ لٹکائے گئے تھے۔ ان کے جسم کا گوشت و پوست چیل کوؤں نے کھا

لیا تھا۔ لیکن مرتے وقت ان کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی۔ گویا زندگی نے موت پر فتح پالی ہو۔

مرحوم کا رویہ شہر کے لوگوں کے ساتھ کیسا تھا؟

مرحوم کی نظروں میں امیر و غریب، تاجر و گدا، عورت و مرد سب برابر تھے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ کالے اور گورے، بھنگی اور برہمن کی تفریق سے واقف نہ تھے۔ تعصب تو انہیں چھو تک نہیں گیا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں نیک و بد کی بھی تمیز نہ تھی۔

مرحوم کا اٹھنا بیٹھنا کن لوگوں میں تھا؟

مرحوم بڑے آزاد، لا اُبالی، فقیر منش آدمی تھے۔ اس لئے اکثر اکیلے ہی رہتے تھے اور چرس کا دم لگاتے تھے۔ انہیں مکروہات دنیا سے نفرت تھی۔ اس لئے زندگی میں بہت کم لوگوں نے ان سے راہ و رسم پیدا کی۔

مرحوم کے دشمنوں کو تم جانتے ہو؟

بڑی اچھی طرح سے۔ مرحوم کا سارا شہر دشمن تھا۔

اور جب وہ مرے تو۔

تو وہ اخبار بھی جنہوں نے زندگی بھر ان کے لئے ایک سطر نہ لکھی۔ پانچ کالمی سرخی چھاپ رہے تھے۔

جگہ جگہ لکھا ہوا تھا "آہ مرحوم"

مرحوم نے کبھی کسی سے عشق کیا؟

مرحوم کو صرف خدا سے عشق تھا۔

مرحوم کیا پیتے تھے ؟

قرض کی پیتے تھے مئے ۔

پھر ؟

پھر ایک دن ان کی فاقہ مستی رنگ لے آئی اور وہ بدحال اور مفلوک الحال ہو گئے اور اُجڑے دیار میں رہنے لگے ۔

اس وقت تم ان کے ساتھ تھے ؟

جی نہیں ۔ میں صرف نماز جنازہ میں شریک ہوا تھا ۔

مرحوم کا اپنے ملک کے بارے میں کیا خیال تھا ؟

مرحوم کو اپنے ملک سے بڑی محبت تھی ۔ لیکن افسوس کہ ملک نے ان کی قدر نہ کی ۔ قوم نے ان کو نہیں پہچانا ۔ ہائے افسوس ۔

مرحوم کا دل کیسا تھا ؟

مرحوم کا دل بڑا احساس تھا ۔ مرحوم کا دل ایک شفاف آبگینے کی طرح تھا ۔ مرحوم کسی دوسرے کو تکلیف میں دیکھ کر خوش نہ ہو سکتے تھے ۔ مرحوم کا دل چوٹ کھایا ہوا تھا ۔ ایک کافر ادا نے انہیں ایسا چرکہ دیا کہ وہ اسے عمر بھر نہ بھلا سکے اور آخر اسی رنج میں گھل گھل کر جان دے دی ۔

اس عورت کا کیا نام تھا ؟

مرحومہ ! خدا بخشے بڑی سلیقے والی عورت تھی ۔ اس کے حسن و جمال کا شہرہ ـــــ

مرحومہ کی نہیں مرحوم کی بات کرو ۔ یہ بتاؤ کہ مرحوم کیا کرتے تھے ؟

مرحوم سب کام کرتے تھے۔ وہ شاعری کرتے تھے۔ فوج میں بھرتی تھے کلرکی کرتے تھے۔ ہل جوتتے تھے۔ دکان داری کرتے تھے۔ مزدوری کرتے تھے۔ چارپائیاں بُنتے تھے۔ پان کی دکان کرتے تھے۔ تانگہ چلاتے تھے۔ مرحوم مصنف تھے۔ مرحوم پبلشر تھے۔ مرحوم دلّال تھے۔ مرحوم کوکین فروش تھے۔ لیکن مرحوم جو بھی کام کرتے تھے۔ اُسے حدِ کمال تک پہنچا دیتے تھے مرحوم نے اپنی زندگی میں سب کام کئے۔ لیکن جب وہ مرے تو صرف ہچکیاں لے رہے تھے۔ اور ان کے اعزّہ واقارب ان کے سرہانے کھڑے رو رہے تھے۔

مرحوم کس طرح مرے؟

مرحوم انتقال فرما کر اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے اور پھر ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

مرحوم کا ثانی کون ہے؟

مرحوم کا ثانی روئے زمین پر کوئی نہیں۔

مرحوم کی جگہ کون پُر کرے گا؟

مجھے تو ان کی جگہ پُر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ حضور پُر نور کی ہستی کے سوا مجھے تو ـــــ

اچھا۔ اچھا۔ اب تم جا سکتے ہو۔

شکریہ۔

ٹھہرو — ٹھہرو — ایک سوال رہ گیا ہے۔ تم مرحوم کو کب سے جانتے ہو؟

میں؟ میں مرحوم کو اس دن سے جانتا ہوں۔ جس دن انہیں موت آئی اور وہ مر گئے۔ آہ!

مرحوم! کیا بتاؤں۔ ع

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

بڑے آدمی

بڑے آدمیوں کی پرستش عرصہ دراز سے جاری ہے اور اس کے پس پردہ خوف کا وہ جذبہ مستور ہے جو کمزور کو قوی سے اور قوی کو قوی تر سے ممیز کرتا ہے ابھی تک آدمی آدمی سے ڈرتا ہے۔ محبت نہیں کرتا۔ پرستش کرتا ہے لیکن محبت نہیں کرتا۔ پرستش اور محبت میں بہت فرق ہے۔

جب انسان جنگل میں رہتا تھا۔ تو جنگل کے دوسرے جانوروں کی طرح اس کا دل بھی شیر کی گرج سن کر دہل جاتا تھا۔ شاید اس خوف نے شیر کے دل میں دوسرے جانوروں کے متعلق ایک جذبہ تحقیر پیدا کر دیا۔ پھر ادھر ڈرپوک جانوروں کے دل میں خوف و ہراس کے جذبے نے عمل معکوس کی صورت اختیار کر لی۔ شیر اب جنگل کی قوت کا مظہر بن گیا اور انسان اس کی پوجا کرنے لگا۔ اور ابھی تک اس کی

پوجا کر رہا ہے۔

شیر بنگال اور شیر پنجاب ہر روز اخباروں کے کالموں میں دندناتے نظر آتے ہیں۔۔۔ ہر بڑا آدمی کسی ایک انسانی گروہ کا شیر ہوتا ہے۔ لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں اور وہ اپنے دل میں انہیں حقیر سمجھتا ہے۔ اور اکثر اس امر کا مظاہرہ کیا کرتا ہے۔ لیکن سب سے مضحکہ خیز صورت وہ ہے۔ جب شیر جنگل کے جانوروں سے ووٹ طلب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے

"میں تمہارا خادم ہوں"

اور جانور اس قدر بے وقوف ہوتے ہیں کہ خود خادم ہوتے ہوئے اسے اپنا خادم سمجھنے لگتے ہیں۔ اور تالیاں بجا بجا کر اسے ووٹ دیتے ہیں اور پہلے سے بھی زیادہ شیر کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔

جنگل کا شیر اور انسانوں کی بستی کے شیر اپنی صفات میں ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ دونوں شدید قسم کے انفرادیت پسند ہوتے ہیں۔ جنگل کا شیر اپنے علاقے میں کسی دوسرے شیر کو گھسنے نہیں دیتا۔ اور یہی حال انسانوں کی بستی کے شیر کا ہے۔ چنانچہ مثل مشہور ہے کہ ایک میان میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔

گاندھی جی ہندوؤں کے شیر ہیں۔ جناح صاحب مسلمانوں کے۔ اول تو اپنے جنگل میں کوئی ان کا حریف پیدا ہو تو سختی سے دبا دیا جاتا ہے۔ دوسرے جنگل سے آئے ہوئے شیر کا تو معاملہ ہی اور ہے۔ اس مرحلے پر جغرافیائی وطنیت کارفرما ہوتی ہے۔ اور ایک جنگل کے جانور دوسرے جنگل کے جانوروں پر پل پڑتے ہیں

اس لئے نہیں کہ خدانخواستہ انہیں جنگل کے دوسرے جانوروں سے بیر ہے۔ ہرگز نہیں!
یہ تو صرف اس لئے ہوتا ہے کہ اپنے جنگل کے شیر کی عزت خطرہ میں ہوتی ہے۔
یعنی جیسے ہم ڈر اور خوف کے احساس سے مغلوب ہو کر لو بیٹھتے ہیں۔ اس کی عزت
خطرے میں ہوتی ہے۔ جب یہ لڑائی شروع ہوتی ہے تو اسے بالعموم "حق و انصاف
کی لڑائی" کہا جاتا ہے۔

جنگل کا شیر اپنی رعایا کے خون پر گزارا کرتا ہے۔ انسانوں کی بستی کا شیر بھی
اسی طرح پلتا اور پروان چڑھتا ہے۔ دونوں اپنی رعایا کا شکار کرتے ہیں اور اس کے
عوض میں رعایا دن رات ان کی پرستش کرتی ہے۔ وہ کہانی تو آپ نے سُنی ہی ہو
گی۔ جب انسانوں کی ایک بہت بڑی بستی پہ ایک دیو نازل ہوا اور شہر سے باہر
ایک کھوہ میں رہنے لگا تھا۔ پھر شہر کے راجہ چھوٹے شیر سے اس نے معاہدہ
کر لیا تھا کہ انسانوں کی بستی سے ہر روز ایک آدمی اس کی خوراک کے لئے کھوہ
میں بھیج دیا جائے گا۔ عرصہ دراز تک انسانوں کی بستی پہ دیو کا ظلم مسلّط رہا اور
عرصہ دراز تک اس بستی کے گلی کوچوں سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔
آخر ایک دن وہ آیا۔ "وہ" یعنی نجات دہندہ۔ شہزادہ عالم۔ اور اس نے
دیو سے لڑ کر اسے مار ڈالا اور اس طرح اس شہر کو دیو کے چنگل سے رہائی
دلائی۔ لیکن یہ پرستان کی کہانی ہے۔ انسانوں کی بستی میں ابھی وہ نجات دہندہ
نہیں آیا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

جب انسان نے جنگل سے ناطہ توڑا۔ اور وادیوں میں دریا کے کنارے

کنارے اپنی بستیاں بسائیں۔ اور اپنے تمدن کو ترقی کی راہ پر چلایا۔ اس وقت بھی وہ شیر کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ شیر کا خوف ابھی تک اس کی روح پر مسلط ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ جنگل کا شیر، شہر کا شیر بن گیا۔ پرستش وہی رہی۔ خوف و ہراس وہی رہے۔ لہو کی ارزانی وہی رہی۔ انسان ازمنہ قدیم سے قرونِ وسطےٰ اور قرونِ وسطےٰ سے زمانۂ جدید میں پہنچا۔ لیکن بڑے آدمی سے اسے نجات نہ ملی۔ وہ قبیلے داری سے سرمایہ داری اور سرمایہ داری سے جمہوریت کے آغاز کی طرف بڑھا۔ لیکن پیرِ تسمہ پا کی طرح یہ بڑا آدمی ہر وقت اس پر سوار ہی رہا۔ میں تمہاری قیادت کروں گا۔ میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ میرے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم طفلِ مکتب ہو۔ تم جاہل ہو، نالائق ہو۔ دھوکہ کھا جاؤ گے۔ میں تمہارا کام کرادوں گا۔ میں تمہارا لیڈر ہوں۔ میرے مشورے پر عمل کرو ۔ ۔ ۔ ۔

اور جب جمہوریت آئی اور انسان کے ذہن میں اجتماعی شعور انگڑائیاں لینے لگا تو شیر نے فوراً اس خطرے کو بھانپا اور پینترا بدل کر کہنے لگا۔ میں تمہارا شیر ہوں کیوں کہ تم نے مجھے شیر بنایا ہے۔ تمہارا فیصلہ میرا فیصلہ ہے۔ میں وہی کرتا ہوں جو تم کہتے ہو۔ دراصل شیر میں نہیں ہوں۔ شیر تم ہو۔ میں تو تمہارا مظہر ہوں۔ تم جب چاہو۔ مجھے ہٹا سکتے ہو۔

لیکن شیر کو کس نے ہٹایا؟ اگر کسی نے ہٹایا بھی تو وہ خود ایک شیر تھا۔ دوسرا شیر، پہلے سے قوی تر! اور انسانوں نے کہا

"یہ بہت بڑا آدمی ہے"

سب اصنام شکستہ ہو چکے۔ لیکن یہ صنم نہیں ٹوٹا۔ ابھی تک صحیح وسلامت ہے۔ شعور وادراک کی ترقی اور سائنسی کارناموں کے باوجود بڑا آدمی ــــ ایک آدمی ـــــ انفرادیت پسند ـــــ اقلیت پسند حاکم زندہ ہے اور ہم پر حکومت کر رہا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں حکومت کر رہا ہے اور مخلوق اپنی اجتماعیت پسندی کے باوجود اس سے دبی جا رہی ہے۔ پسی جا رہی ہے۔ اپنے لہو کا خراج ادا کر رہی ہے۔ کیوں کہ جنگل کا خوف ابھی تک اس کے ذہن کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اگر یہ خوف انسان کے دل سے نکل جائے اگر وہ یہ سمجھ لے کہ بڑا آدمی درحقیقت بڑا انسان نہیں ہے۔ اگر جنگل کے سارے جانور اتحاد کر لیں تو بڑے سے بڑا شیر جھک جائے گا اور بھیگی بلی بن کر اتحادیوں کے اشارے پر چلے گا اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو خود ہی یہ جنگل چھوڑ دے گا۔۔۔۔ لیکن اجتماعیت پسندی ابھی اس منزل پر نہیں پہنچی۔ ابھی یہ احساس عام نہیں ہوا کہ جب ایک آدمی "بڑا" ہوتا ہے تو ہزاروں چھوٹے چھوٹے آدمیوں سے بڑائی چھن جاتی ہے۔ ورنہ بڑا آدمی جمہوریت پسندوں کا بڑا آدمی بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کرتا۔ تمہیں اس موقعہ پر یہ کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اسے فوراً جواب مل جاتا تم کون ہو مجھے بتانے والے۔ میں خود جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔ اس قوم کا بچہ بچہ جانتا ہے اسے کیا کرنا ہے اس ملک کا ہر فرد اپنا فرض خوب پہچانتا ہے۔ تم بھی ہماری طرح ایک آدمی ہو۔ بڑا آدمی بننے کی کوشش نہ کرو۔

لیکن ابھی تک کہیں بھی، کسی ملک میں، کسی قوم میں، یہ ردِعمل نہیں نظر آتا۔

ہندوستان بے چارے کی تو بات ہی اور ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی جہاں انسانی آبادی نوّے فی صدی تعلیم یافتہ ہے۔ بڑے آدمی پائے جاتے ہیں۔ ان کی تقاریر ریڈیو پر سنی جاتی ہیں۔ ان کے پیغام اخباروں میں جلی حروف میں شائع کئے جاتے ہیں۔ لاکھوں آدمی ان کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ان کے سگار کا ایک کش، ان کی مونچھ کا ایک بال، ان کے جوتے کی ایک کیل، لاکھوں انسانوں کی زندگی سے زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے۔۔۔۔ جنگل!

ابھی تک زندگی کے ہر شعبے میں اکثریت پر اقلیت کی حکومت سمجھی جاتی ہے۔ جمہوریت پسند بھی ہر بار یہی کہتے ہیں۔

"آؤ عوام میں کام کریں۔ عوام کو اپنا ہم خیال بنائیں"

ایک بنیادی سوال یہ ہے۔ کیوں عوام میں کام کریں۔ عوام؟ گویا تم خواص میں سے ہو۔ ایک تفریق تو اسی وقت پیدا ہو گئی۔ جب تم نے دوسروں کو "عوام" کہہ کر خود کو بانس پر چڑھا لیا۔ اوہ۔۔۔ بڑے دیوتا ہیں آپ۔۔۔۔ مونٹ ایورسٹ پر بیٹھے ہوئے نیچے "عوام" کو دیکھ رہے ہیں۔ عوام میں کام کریں! گویا عوام اپنا بُرا بھلا نہیں جانتے۔ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ جاہل سے جاہل انسانی گروہ کا فیصلہ فرد کے فیصلہ سے بہتر ہوتا ہے۔ پھر تم اپنی رائے ان پر کیوں ٹھونستے ہو۔ اقلیت کی رائے اکثریت پر، انہیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟ تم کیوں نہیں عوام کے ہم خیال ہو جاتے۔

"یہ خیال شروع میں اقلیت ہی اپناتی ہے"

اس طرح تو پھر انسان کو شیروں سے کبھی نجات نہیں مل سکے گی۔ دنیا کو ہمیشہ بڑے

آدمیوں کی ضرورت رہے گی۔ یہی نطشے کہتا تھا یہی آج ویلز کہتا ہے۔ پھر وہ تمہارا عمومی فلسفہ کہاں گیا؟

حقیقت یہ ہے کہ آج تک بڑے آدمیوں نے دنیا کے لئے کچھ نہیں کیا۔ بُرائی کے سوا، اپنی برطائی کو بڑھانے کے لئے ان سے کسی دوسرے کام کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ بشریت کی فلاح و بہبودی بڑے آدمیوں کے کارناموں میں نہیں۔ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی مشترکہ مساعی پر منحصر ہے۔ ہلاکو سے ہٹلر تک کسی ایک "فاتح اعظم" کی ذاتی خصوصیات پر غور کیجئے۔ ان کی سرشت میں خود پرستی، خود ستائی اور انسانی زندگی کی تحقیر کا اتنا دخل ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کہ لاکھوں انسان ان کی کیوں پرستش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اگر ان کی پرستش کرنے اور ان کے لئے لڑنے مرنے کی بجائے الگ ہو کر ایک طرف بیٹھ جائیں اور ان بڑے لوگوں کو میدان کارزار میں اکیلا چھوڑ دیں تو انسان کی صعوبتیں ایک ہی دن میں ختم ہو جائیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہلاکو اور ہٹلر کے علاوہ دنیا میں ایسے بڑے آدمی بھی ہیں جنہوں نے انسانی برتری اور بہبودی کے لئے واقعی کام کیا ہے مثلاً مفکر فلسفی، معلم، ادیب، سائنس دان۔

لیکن میں تو انہیں بھی بڑا آدمی سمجھنے سے انکار کرتا ہوں۔ ان میں بہت سے ایسے بڑے آدمی ہیں۔ جنہوں نے اپنے فلسفے میں، ادب میں، سائنس کی ایجادات میں انسانی تخریب کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی امکانی کوشش کی ہے۔ جنہوں نے "شیرون" سے فلسفے کو سراہا ہے اور اسی قسم کے ادب

کی تخلیق کی ہے۔ اور اسی قسم کے ہتھیار بنائے ہیں۔ جو شیروں کی حکومت کو انسانی آبادی پر زیادہ سے زیادہ عرصے تک قائم رکھ سکیں جو چند ایسے بڑے آدمی باقی رہ گئے ہیں: جو اس فہرست سے خارج ہیں۔ ان کے تعمیری کارناموں میں بھی ان ہزاروں چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی علمی، ادبی، سائنسی تجربات کو دخل ہے۔ کہ جن کی مشترکہ کاوشوں سے انسانی علم و فن کے خزینے بھرے گئے ہیں پھر ہم تاج محل پر آخری اینٹ لگانے والے کو تاج محل کا خالق کیوں سمجھیں ہیملٹ کے کردار کے لئے شیکسپیئر کو کیوں سراہیں۔ کشش ثقل کے اصولوں کا خدا نیوٹن کو کیوں ٹھہرائیں؟

اگر گاندھی جی نہ ہوتے تو کیا ہندوستان میں آزادی کی تحریک نمودار نہ ہوتی؟ اگر جناح صاحب نہ ہوتے تو کیا مسلمان پاکستان کا مطالبہ نہ کرتے؟ اور پھر جہاں ایک لیڈر کا پسینہ گرتا ہے۔ وہاں ایک سو رضاکاروں کا لہو نہیں بہتا ہے؟ جب تک ریلوے انجن بنتا ہے تو کیا لوہے کو پگھلانے سے لے کر لوہے پر رنگ کرنے تک تمام سائنسی عملے حرکت میں نہیں آتے؟ جب ایک افسانہ لکھا جاتا ہے تو حروفِ ابجد سے لے کر ان تمام نرم و نازک خیالات کے تانے بانے سامنے نہیں ہوتے۔ جن کے رنگین نقوش اُن سینکڑوں بلکہ ہزاروں مصنفین کے موقلم نے اُگلے ہیں کہ جن کے نام سے بھی کوئی آگاہ نہیں؟ جب ایک نیا فلسفہ مرتب کیا جاتا ہے تو اس کی ترتیب و تواتر میں وہ ان گنت جزئیات اور کڑیاں نہیں ہوتیں جو ایک نہیں سینکڑوں فلسفیوں نے شب و روز کی جانکاہ کاوشوں کے بعد تعمیر کی ہیں؟

پھر ان تمام چیزوں کا خالق ایک آدمی کیسے ہوسکتا ہے۔ اور خاص طور پر وہ "بڑا آدمی" جو اپنے آپ کو یوں منتشر کرتا پھرتا ہے۔ کہ مَیں خالق ہوں اس فلسفے کا، اس ادب کا، اس سائنس کا، اس ایجاد کا، مَیں پیغمبر ہوں! مَیں بڑا آدمی ہوں! کیوں ہم اس آدمی کی پرستش کریں۔ اسے جوتے کیوں نہ لگائیں؟

اگر آپ کسی عام آدمی، کسی انگریز، جرمن، ہندوستانی، فرانسیسی، چینی، امریکن، حبشی، کسی ملک یا کسی قوم کے ایک آدمی سے بات کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ ایک عام آدمی ہو۔ بڑا آدمی نہ ہو تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ وہ کتنا اچھا آدمی ہے۔ اس کا دل مہر و محبت کا سرچشمہ ہے۔ وہ اپنے ہمسایوں سے محبت کرتا ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا کہ اسے اس کے گھر میں اس کے چھوٹے سے باغیچے میں اس کے کھیتوں میں کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ وہ اپنے دوستوں اور اپنے کام کرنے والے ساتھیوں کے درمیان ہنستے کھیلتے اپنی زندگی بسر کرنی چاہتا ہے۔ وہ بُرا انسان نہیں ہے کیونکہ وہ بڑا انسان نہیں۔ وہ دوسروں کے حقوق غضب کرنا نہیں چاہتا۔ دوسروں کی آزادی چھیننا نہیں چاہتا۔ صرف اپنے حقوق، اپنی آزادی چاہتا ہے، یہ فتنہ تو صرف بڑے آدمیوں اور ان کی جماعتوں نے جگا رکھا ہے۔ یہ لوگ اقلیت میں ہیں اور انسانوں کے حقوق پر چھاپہ مارے بیٹھے ہیں۔ جب تک یہ لوگ موجود رہیں گے۔ نہیں کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔ اور ہر بیسویں سال نئی انسانی نسل کو ذبح کرتے رہیں گے۔ ان سے کسی بہتری کی توقع ہی نہیں کی جا

سکتی۔ ہماری ترقی بڑے آدمیوں کی حد سے بڑھی ہوئی خود پرستی، ہوس اور پندار جاہ وحشم سے نہ ہو گی۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی مشترکہ مساعی سے ہو گی۔ نئی دنیا بڑے آدمیوں کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اچھے آدمیوں کی ضرورت ہے!

دیکھنے، دیکھنے۔ وہ رہا ایک "بڑا آدمی"۔۔۔ شیر آیا، شیر آیا، دوڑنا۔۔ا۔!

ردّی

تعریف

یہ غلط ہے کہ ہر بری اور رذیل شے کو ردّی کہتے ہیں۔ دراصل ردّی صرف اسی شے کو کہا جاتا ہے جو ردّی ہو اور یہی ردّی کی تعریف ہے۔

مثال۔

یہ مضمون کیسا ہے؟ ردّی!

یہ افسانہ نگار کیسا ہے؟ ردّی! (موذن مرحبا بروقت بولا۔ تری آواز) ردّی!

یہ ڈاکٹر کیسا ہے؟ ردّی!

یہ کپڑا کیسا ہے؟ ردّی!

یہ کھیل کیسا ہے؟ ردّی!

یہ کاغذ کیسا ہے؟ ردّی!

یعنی اگر بری سے بری شے کی بری سے بری حالت دکھانی مقصود ہو۔ تو بھی اسے ردّی ہی کہیں گے۔ ردّی نہ گھٹانے سے گھٹتی ہے اور نہ بڑھانے سے بڑھتی ہے۔ بلکہ ہر جگہ ہر حالت میں ردّی ہی رہتی ہے۔ اگر ردّی میں ردّی کو جمع کر دیجئے تو کل میزان ردّی ہوگی۔ اگر ردّی میں سے ردّی نکال لیجئے تو بقایا پھر ردّی ہے اگر ردّی کو ردّی سے ضرب دیجئے۔ تو حاصل ضرب ردّی ہے۔ اگر ردّی کو ردّی پر تقسیم کیجئے تو پھر بھی آخر ردّی حاصل ہوگی۔ ردّی کا ذو اضعاف اقل بھی ردّی اور ردّی کا عاد اعظم بھی ردّی۔

اور دنیا میں یہ فخر صرف ردّی کو حاصل ہے! گویا ردّی بھی مادّے کی طرح اٹل ہے۔ ایک ہی صفت، ایک ہی وزن، ایک ہی خوبی کی مالک ہے۔۔۔۔۔۔ ردّی!

جنگ سے پہلے ردّی کی حالت غیر تھی۔ ہر شخص اس سے نفرت کرتا تھا۔ ردی کا نام ذہن میں آتے ہی زندگی کے تمام گھناؤنے پہلو اپنے بدصورت نگارخانوں کو لیے تخیل میں آموجود ہوتے ہیں۔ ردّی کا ذکر آتے ہی ان کباڑ خانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جہاں پر کرم خوردہ کتابیں شیشیوں کے ٹوٹے ہوئے بلے، کوڑا، سہ رنگی تصویروں والے رسالے اور اخبار، چینی کے ٹوٹے ہوئے برتن، مرمر کے شکستہ بُت، میزیں، جنہیں دیمک چاٹ گئی تھی۔ اور سڑے ہوئے ربڑ کی پتلیاں جن میں

کسی زمانے میں گرم پانی بھرا جاتا تھا۔ رکھی رہتی ہیں یا پنساری کی وہ دکان جہاں ہلدی سے انبار ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی کی طرح بلند ہوتے اور دار چینی یا قہوہ کی طرح اوذ نمک پسا ہوا بکتا۔ ردی کے ساتھ ہمیشہ ردی چیزوں کا خیال آتا تھا۔ دراصل یہ ردی کی خاصیت ہے۔ اس کا کیمیائی عمل یہ ہے کہ جس چیز کو چھوتی ہے۔ اُسے بھی ردی بنا دیتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک طرح کا پارس پتھر ہے۔ میں نے ہزار بار کوشش کی۔ لیکن ردی دیکھ کر یا ردی کا خیال کرتے ہوئے بھی میرے ذہن میں کبھی مے خوش رنگ، لب لعلین، سنبل و ریحان، چشم آہو کی یاد تازہ نہیں ہوتی۔ اگر یاد آئی بھی تو باسی پکوڑیوں کی بسڑے ہوئے شامی کبابوں کی، یا اس پرانے جوتے کی جسے میں موچی کے پاس کئی بار مرمت کرانے لے جاتا ہوں۔ اس پہ میری یہ ہمت کہ ردی کی تعریف پر مضمون لکھ رہا ہوں۔ میری جرأت کی داد دیجئے۔ فرہاد کو کو بکنی بھی اس کے مقابلے میں چیلنج ہے یعنی بالکل ردی ہے!

دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے نہ صرف ردی مضمون لکھنے والوں یا ردی پر مضمون لکھنے والوں کی حالت غیر تھی۔ بلکہ ردی سے متعلق کسی قسم کی تجارت کرنے والوں کا حال پتلا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں جب ہر مہینے کی پندرھویں تاریخ کو جیب ٹٹولتا اور جیب میں سگریٹ کے بھی پیسے نہ پاتا تو ناچار ردی کا رُخ کرتا۔ اس وقت منوں ردی بیچ کر بھی سگریٹ کے پیسے حاصل نہ ہوتے تھے۔ بہت ہوا تو ایک پیکٹ خرید لیا کو نڈر کا، اس شان سے کہ حاتم طائی کی قبر پر گویا لات مار دی۔ میرا مطلب ہے کہ ردی ماردی اور اگر ردی بیوی سے ہتھے چڑھ گئی تو وہ منے کے لئے جھنجھنا خرید لیتی تھی۔ اور ایک بار تو شاید ریڈ کی سالم گڑیا ردی کے عوض میں ملی تھی لیکن

اگر دیکھا جائے تو جھنجھنے اور ربڑ کی گڑیا سے دل کا سودا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ردّی کی تجارت میں کوئی خاص نفع نہ تھا۔ ردّی بیچنے والوں کا بازار الگ تھا۔ وہاں اکثر چوہوں کی بہتات رہتی۔ انہیں کوئی عزّت کی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا۔ میرا مطلب ردّی بیچنے والوں سے ہے چوہوں سے نہیں۔ کباڑیئے اور میونسپل کمیٹی کی کوڑا کرکٹ کی لاری کا ڈرائیور اور گلی گلی ردّی بیچنے والے تو خیر بُرے تھے۔ لیکن ہم لوگ بھی جو کبھی کبھار ردّی بیچتے تھے۔ بُری نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ کمینہ، کم ظرف خسیس، ردّی تک بیچ ڈالتا ہے۔ اور اس قسم کے القاب سے یاد کئے جاتے جنگ سے پہلے میں اگر یہی ردّی پہ مضمون لکھتا۔ تو ایڈیٹر فوراً اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتا۔ جو عموماً ایڈیٹر کی میز کے نیچے اس کے قدموں میں رکھی ہوتی ہے کہ عورت اور ردّی کا یہی ٹھکانہ ہے اور ردّی پہ جو مضمون ہو اس کا حشر بھی یہی ہونا چاہیئے۔

لیکن یہ سب جنگ سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب صرف اچھے مضمون ردّی کی ٹوکری میں پھینکے جاتے ہیں۔ اور ردّی کی ٹوکری بھی میز کے نیچے نہیں بلکہ میز کے اوپر ایڈیٹر کے سامنے رکھی رہتی ہے اور ردّی کا ایک ایک پرزہ اس میں احتیاط سے گن کر ڈالا جاتا ہے۔ بینک کا منیجر بھی نوٹوں کو اس احتیاط سے نہیں گنتا۔ کہ جس احتیاط سے یہ ردّی گنی جاتی ہے۔ خدا بارہ برس کے بعد ردّی کی بھی سنتا ہے۔ بلکہ بیس برس ہی سمجھئے۔ کیونکہ پچھلی جنگِ عظیم غالباً ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تھی۔ کچھ ٹھیک طرح سے یاد نہیں رحساب کر لیجئے۔ ہم نے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تو کیا ردّی پہ ہی مضمون لکھتے۔

جنگ میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ چیزیں مہنگی ہو جاتی ہیں اور آدمی سستے ہو جاتے ہیں۔ چاہے یہ جنگ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہو یا جمہوریت کے خلاف یا فسطائیت کے خلاف یا جاگیرداروں کے خلاف۔ جنگ کا یہ ایک ایسا اقتصادی پہلو ہے۔ جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ امر اتنا ہی آسان اور بدیہی ہے جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں اور نو دو گیارہ ہوتے ہیں اور جنگ میں صرف ہندسے ہی نہیں بلکہ لوگ بھی نو دو گیارہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن خیر ہر جنگ میں یہ قربانی ناگزیر ہوتی ہے۔ اس قربانی کے بغیر ظلم کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی لئے انسان کو مہنگائی بھی ایک حد تک گوارا ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک حد تک، اور جب مہنگائی اس حد سے تجاوز کر جائے تو بڑی مضحکہ خیز بات بن جاتی ہے عموماً اس مضحک صورت کو جنگی مزاج کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مضحک صورت یہ ہے کہ آدمی سترہ روپے میں بکتا ہے اور جوتا اٹھارہ روپے میں اور ایک اچھا جوتا اڑتالیس روپے میں۔ پہلے اڑتالیس روپے میں ایک بھینس آتی تھی اب اتنے روپلوں میں تین آدمی بکتے ہیں۔

کوئلہ لیجئے کوئلے کا بھاؤ جو بڑھنے لگا تو گیہوں کے برابر ہو گیا۔ بازار جائیے تو کوئلہ بھی اسی بھاؤ میں ملتا ہے۔ جس بھاؤ گیہوں۔ اب چاہے کوئلہ کھائیے چاہے گیہوں۔ چاہے گیہوں جلائیے چاہے کوئلہ۔ پھر کوئلے کا بھاؤ جو بڑھنا شروع ہوا۔ تو گندم سے دگنا ہو گیا۔ یعنی اب اشرفیاں گٹیں اور کوئلوں پہ مہر میں زیادہ فائدہ نظر آنے لگا۔ اور لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ کوئلوں کی بجائے گیہوں جلائیں، پھر جب گیہوں بھی نہ ملا تو وہ اپنا جی جلانے لگے اور جب بالکل ہی جی

جان سے گزر گئے۔ تو گئے دونوں جہاں نظر سے گزر۔ تیری صورت کا کوئی بشر نہ ملا پڑھنے لگے۔

یہی حال تانبے کا ہوا۔ یعنی جب تانبے کا بھاؤ بڑھنے لگا تو اس قدر بڑھا کہ بازار میں پیسہ تک دیکھنا مشکل ہوگیا۔ بھاؤ اس قدر بڑھا کہ چاندی سے بھی بڑھ گیا۔ پھر کیا تھا لوگوں نے بینکوں سے اپنی چاندی کے زیور نکلوا لیئے اور ان کی جگہ تانبے کے برتن رکھ دیئے۔ پھر روئی کا بھاؤ جو بڑھنا شروع ہوا تو سونے کے بھاؤ بھی بڑھ گئے۔ میں نے اسی دم اپنی بیوی کے سونے کے زیور بیچ دیئے۔ اور اپنے گھر کے ٹرنک اور لحاف بینک میں محفوظ کرا دیئے کون جانے بھئی کس دم کیا ہوتا ہے۔ میاں یہ جنگ ہے۔ اپنا مال بینک میں محفوظ کرا دو۔ ہاں!

اور پھر کاغذ، ہاں صاحب کاغذ بھی دو دن کی لینے لگا۔ یہ ذلیل چیتھڑا جو بانس کے ریشوں اور میلے کچیلے کپڑوں سے بنتا ہے۔ یہ بھی صاحب کیا بتاؤں، آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا بھاؤ جو اوپر چڑھنا شروع ہوا تو کوئلے اور گیہوں کے بھاؤ سے بھی بڑھ گیا۔ مجھے وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے۔ ان دنوں رسالوں کے مالک اور ناشر لوگ بہت پریشان تھے۔ خریدار رسالے اور کتابیں مانگتے تھے اور ناشر کہتا تھا کہ دو سیر گیہوں لے لو۔ تین سیر کوئلے لے لو لیکن رسالہ یا کتاب طلب نہ کرو۔ مضمون نگار اپنا مضمون حفظ کر کے ایڈیٹر کو سناتا تھا۔ اور اگر وہ ایڈیٹر کو پسند ہوتا تو وہ مضمون ــــ میرا مطلب ہے کہ مضمون نگار کو کاتب کے حوالے کر دیتا۔ اور مضمون نگار پھر کاتب کو اپنا مضمون سناتا۔ تب جا کر کاتب کتابت

شروع کرتا۔ اور بعد میں جب کاغذ اور بھی گراں ہو گیا۔ تو کاتب کو بھی مضمون سے
حفظ کرنا پڑتا اور وہ لیتھو کے پریس میں جا کر حروف کنندہ کرتا اور اس طرح کہیں جا
کر پرچہ چھپتا۔

لیکن کاغذ کی گرانی اور بھی بڑھتی گئی اور پھر کاغذ کی قیمت کپڑے سے بھی
بڑھنے لگی۔ ان دنوں میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندو مسلم کی مناسبت سے ہندو
اخبار اپنے خریداروں کو اخبار کی بجائے ایک دھوتی دیا کریں اور مسلمان اخبار
لٹھے کی شلوار، اور جو ادبی پرچے ہوں وہ کاغذ کی بجائے کپڑے پر چھپیں۔ کپڑے
ہی کی مضبوط جلد ہو اور کپڑے ہی کے ورق، یا پلین کے ورق، یا لٹھے کے ورق، یا
سپید ریشم کے ورق اور رنگین چھینٹوں پر سہ رنگی تصاویر شائع ہوں۔ اعلانات
اس قسم کے ہوں۔

"رسالہ ساقی پڑھئیے کورے لٹھے پہ شائع ہوتا ہے خالص
پاپلین کی جلد ہے۔ جسے دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ ساقی بجلوۂ
دشمنِ ایمانؑ آگہی۔"

"رسالہ ہمایوں ہر یکم تاریخ کو نہایت باقاعدگی سے چھبیس نمبر کی
ململ پر شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے نے آج تک کبھی کھدر استعمال نہیں
کیا۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔"

"رسالہ ادب لطیف پڑھیئے۔ ہندوستان کا واحد ترقی پسند
ماہنامہ ہمیشہ ہاتھ کا بنا ہوا دوسوتی کپڑا استعمال کرتا ہے۔ رسالہ
ادب لطیف پڑھئے اور اپنے ملک کے جولاہوں کی مدد کیجئے۔ مزدور

کسان زندہ باد!"

پہلے پہل صرف سگریٹوں کے پیکٹ لوٹائے جاتے تھے۔ پھر کپڑوں پر چھپے ہوئے رسالے بھی لوٹائے جانے لگے۔ بصورت دیگر ناشر لوگ نئی کتابیں اور نئے رسالے دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان پرانے رسالوں کو لانڈری میں بھیج دیا جاتا۔ جہاں سے یہ رسالے دُھلے دھلائے واپس آجاتے اور پھر مطبع میں چھپ کر انہیں خریداروں کو بھیج دیئے جاتے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ ہر مطبع کے سامنے رسالے دھونے والی لانڈری بھی کھُل گئی۔ آپ نے کئی جگہ اس قسم کا اشتہار پڑھا ہو گا۔

صفاچٹ لانڈری

یہاں رسالہ ساقی دھویا جاتا ہے۔

عید نمبر، افسانہ نمبر اور رسالنامے بھی ڈرائی کلین کیے جاتے ہیں۔

زنانہ رسالوں کو دھونے کا خاص انتظام ہے

صفاچٹ لانڈری

سے

اپنا رسالہ، اپنی کتاب، اپنا اخبار دُھلوایئے۔

اور اک

نیا اخبار، نیا رسالہ، نئی کتاب حاصل کیجئے۔

اللہ جو شوق سے تو کتابیں پڑھا کرو۔

لیکن اب وہ زمانہ بھی قریباً بیت چکا ہے

اب اک نیا دور آیا ہے
ردّی کی قیمت بڑھ رہی ہے۔
بازار سے اگر آپ ایلومینیم کا برتن خریدیں۔ مثال کے طور پہ اگر آپ ایک دیگچی خریدیں۔ تو چھ سات روپے میں مل جائے گی۔ لیکن یہی دیگچی اگر آپ توڑ پھوڑ کر دوسرے دن کباڑیئے کے پاس لے جائیں۔ تو وہ اس کے آپ کو آٹھ نو دس روپے تک دے دے گا۔ کیوں کہ ایلومینیم ایک قیمتی دھات ہے۔ سب دھاتوں میں ہلکی دھات ہے۔ اس لیے ہوائی جہازوں کی تعمیر میں کام آتی ہے۔ اور ایلومینیم اکٹھا کرنے کا اس کے سوا اور کیا طریقہ ہے کہ لوگوں سے ایلومینیم کی بنی کار چیزیں مول ضرور لے لی جائیں۔ چنانچہ آج کل کئی لوگوں نے تجارت شروع کر رکھی ہے۔ وہ بازار سے نیا برتن لاتے ہیں اور پھر اسے توڑ پھوڑ کر سوائے یا ڈیوڑھے داموں کسی کباڑیے یا ایلومینیم اکٹھا کرنے والوں کے پاس بیچ دیتے ہیں۔
یہی حال ردّی کا ہے۔
ردّی اکٹھا کرنے اور ردّی بیچنے والوں کے مزے ہیں۔
ردّی کی قیمت اصل کاغذ سے دوگنا ہو گئی ہے۔
چنانچہ اگر آپ بازار سے ایک کتاب، کوئی ایک کتاب خرید لیجئے۔ چلئے میری کتاب ہی خرید لیجئے۔ آخر اس میں رکھا کیا ہے؟ اور پھر اس کتاب کو خرید کر سیدھے کباڑیئے کے پاس لے جائیے۔ تو وہ اسے تول کر آپ کو دام دے گا۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح سے جو قیمت آپ نے اس

کتاب کی ادائی ہے ۔ اس سے دُگنے دام آپ کو کباڑیئے سے مل جاتے ہیں
کیوں کہ ناشر تو ابھی تک کتاب تول کر نہیں دیتے ۔ وہ تو یوں ہی اٹکل پچو
کتاب کی قیمت لگا دیتے ہیں ۔ اور کباڑیا کتاب کا مضمون دیکھ کر نہیں کتاب
کا وزن تول کر قیمت لگاتا ہے ۔ چنانچہ آج کل کتاب لکھنے میں یا کتاب چھاپنے
میں اتنا فائدہ نہیں ، جتنا کتاب کو ردی بنا کر بیچنے میں ۔ اس سے ایک خاص
فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ اب نفس مضمون یا سٹائل پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ۔
اور اگر دیکھا جائے تو باقاعدہ حروف لکھنے کی بھی ضرورت نہیں ۔ یہی کافی ہے
کہ آڑی ترچھی لکیریں کاغذ پر کھینچ دی جائیں اور کتاب کو پریس میں چھاپ لیا جائے
اور پھر اسے فوراً کباڑیے کے ہاں فروخت کر دیا جائے ۔ میں سوچتا ہوں ۔
اس طرح ایک کتاب کے ایک مہینے میں ایک نہیں درجنوں ایڈیشن نکل سکتے ہیں
اور فوراً کباڑیے کے پاس فروخت کئے جا سکتے ہیں ۔ کیوں کہ کورا کاغذ آج کل ردی
سے بہت سستا ہے ۔

ذرا اندازہ لگائیے کہ میں دفتر سے ۷۵ روپے تنخواہ پاتا ہوں ۔ دس پندرہ
روپے پندرہ بیس مضمون لکھ کر مہینے میں کما لیتا ہوں ۔ پھر ایک درجن کتابوں
کی چھ روپے رائلٹی بھی آتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود جنگ کی
وجہ سے جنگائی اس قدر زیادہ ہے کہ اگر میں ردی نہ بیچوں تو گھر کا خرچ
کبھی پورا نہ کر سکوں ۔

چنانچہ ہر ماہ جو رسالے ، اخبار اور کتابیں میرے پاس آتی ہیں صرف انہیں
کباڑیے کے حوالے کر کے میں ایک سو ، سوا سو روپیہ کما لیتا ہوں ۔ اب سوچتا

ہوں۔ یہ تو بہت ہی نفع بخش تجارت ہے اور اگر ردّی کی قیمت اس طرح بڑھتی گئی تو وہ دن دور نہیں۔ جب مصنّف کو اپنا مسوّدہ ناشر کی بجائے ردّی والے کے پاس فروخت کرنے میں زیادہ فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ ردّی والا نفس مضمون نہیں دیکھتا۔ وزن دیکھتا ہے!

میرے دوست کا بیٹا

تین سال کی خاموشی کے بعد میرے دوست نے مجھے خط لکھا تھا "تمہاری کہانیوں کو پڑھتے پڑھتے اب تم سے مایوسی ہو چلی ہے۔ تم ایک بہت بڑے ادیب بن سکتے تھے لیکن آخر میں ایک بہت بڑے پمفلٹ باز بن کے رہ گئے۔ تمہاری کہانیوں میں پروپیگنڈے اور خطابت اور بے کار کی لکچر بازی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تمہاری کہانیوں کا انجام پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اب ان میں وہ مزہ نہیں رہا......"

لمبا چوڑا خط تھا پرانی باتیں، نئے شکوے، میرے دوست نے جس اونچے کھمبے پر بیٹھ کے مجھے خط لکھا تھا وہ اسے زیب بھی دیتا تھا۔ وہ بہت امیر آدمی تھا اور لاکھوں روپے کا بلیک مارکیٹ کا دھندا کرتا تھا۔ روئی، چاول، سیمنٹ، لوہا، کاغذ، موٹر، کار، بائیڈ، لپ اسٹک کس چیز میں اس نے بلیک مارکیٹ نہیں کیا تھا وہ جس سے کو ہاتھ لگاتا تھا وہ بازار سے غائب ہو جاتی تھی اور پھر چوری چھپے سے نے

کے بھاؤ بکتی تھی۔ میرا دوست کبھی پکڑا نہیں گیا۔ کیونکہ وہ پکڑنے والوں کو چندہ دے کر خوش رکھتا تھا۔ یعنی لگے ہاتھوں اس نے اُن کی دیانت داری اور دیش بھگتی کو بھی کالے بازار میں بیچ دیا تھا۔ میرا دوست بڑا چالاک تھا۔ سیانا، لیکن ایک بہت بڑی خوبی اس میں تھی وہ ادب کا بھی قدر دان تھا۔ شاعری کا عاشق اور کہانیوں اور ناولوں کا دلدادہ، اس کے پاس ادب کی ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔ وہ ادیبوں کا پرستار تھا اور اکثر ان کی خاطر تواضع کر کے بہت خوشی محسوس کرتا تھا۔ اس لئے جب اس کا یہ خط میرے پاس آیا تو میں بہت اُداس ہو گیا۔ ہر لکھنے والے کو اپنا ادب عزیز ہوتا ہے۔ وہ تعریف سے خوش ہوتا ہے۔ اور اپنی برائی سُن کر رنجیدہ ہوتا ہے۔ یعنی اس معاملے میں وہ بالکل دوسرے انسانوں کی طرح ہے جو اپنی محنت کی ستائش اور اس کا صلہ چاہتے ہیں۔

خط ساڑھے چار بجے کی ڈاک سے آیا تھا۔ میں نے اُسے ایک بار پڑھا، دوسری بار پڑھا، تیسری بار پڑھا اور پڑھ کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ اور گھر سے باہر چہل قدمی کے لئے نکل گیا سر جھکائے ہوئے متفکر اور ملول چلتے چلتے یکایک میرے دل میں اپنے دوست کی محبوبہ کا خیال آیا۔ جب میرا دوست بمبئی میں تھا تو اس نے ایک محبوبہ پال تھی۔ جیسے لوگ طوطا یا بلبل پال لیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پہلے ہی سے ایک گری ہوئی دیانت مزاج لڑکی تھی۔ اور ایک سجے سجائے گھر میں رہتی تھی جہاں دو نوکر تھے۔ صوفہ سیٹ تھے۔ آرام کرسیاں تھیں ریڈیو تھا اور ایک خان صاحب تھے جو اس کے گھر بار کا سارا خرچ پورا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کا نام گل بانو رکھ چھوڑا تھا اس سے پہلے اس کا نام کچھ اور

تھا اور جب میرے دوست نے اُسے پالا تو اس نے اس کا نام رام پیاری رکھ دیا۔ رام پیاری بڑی بھولی لڑکی تھی وہ گری ہوئی عورت ہو کے بھی اپنے مرد سے محبّت کی خواہاں تھی۔ خاں صاحب نے اسے روپیہ دیا۔ لیکن محبت بالکل نہیں دی۔ بے چارے شریف آدمی تھے۔ جو چیز ان کے پاس نہیں تھی، کہاں سے دیتے محبت تو میرے دوست کے پاس بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ ایک مدت سے کالے بازار کا دھندا کرتا تھا، لہٰذا وہ محبت بھی اسی ڈھنگ کی لے آیا۔ اور گل بات تو یعنی رام پیاری کو لاسے پر لگا لیا اور اُسے ایسا چھانسہ دیا کہ وہ اپنا کاروبار سب بھول کے اسی کی محبّت کے گیت گانے لگی۔ اسی دوران میں رام پیاری کے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جو بالکل اپنے باپ کی بھوری آنکھیں، سنہری بال، اور موٹے ہونٹ لئے ہوئے تھا۔ میرے دوست کو اپنے بیٹے سے بڑی محبّت تھی مگر رام پیاری کے جسم میں اس بچے کے بعد میرے دوست کے لئے وہ کشش اور جاذبیت نہ رہی اور کچھ یہ بات تھی کہ ان دنوں وہ دلی میں شکر کی ایک بہت بڑی بل کھڑی کرنے کی اسکیم سوچ رہا تھا۔ چنانچہ بچے کی پہلی سالگرہ کے چند مہینوں کے بعد وہ ایک دن اچانک بمبئی سے رخصت ہو گیا اور اس نے رام پیاری یا مجھے یا اپنے اور کسی عزیز دوست کو بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ ایسے غائب ہوا جیسے کنٹرول ہوتے ہی کوئی کپڑا بازار سے غائب ہو جاتی ہے۔ اب تین سال بعد اس کا یہ خط آیا تھا اور یکا یک میرے دل میں اس کی محبوبہ کا خیال آیا اور معاً میں نے سوچا کہ کیوں نہ چل کے اس بے چاری کی خیریت جانے کس حال میں ہو گی۔

یہی سوچتا سوچتا میں لوکل ٹرین سے باندرے پہنچ گیا۔ اور رام پیاری کے

مکان کی طرف چلا۔ اس وقت چھ بج چکے تھے۔ اور یہ گانا لین کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ اس لین کے آخری سرے پر وہ مکان تھا جس کی پہلی منزل میں رام پیاری رہتی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو اندر سے اس کا پرانا نوکر آنکھیں جھپکاتا ہوا باہر نکلا۔ مجھے پہچان کر مسکرانے لگا۔

بولا "سیٹھ بھی آئے ہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ خالی میں ہی آیا ہوں"

"آیئے۔ آیئے" وہ دروازہ اچھی طرح سے کھولتے ہوئے اور خود ایک طرف ہو کے بولا "اندر چلے آیئے"

میں نے اندر آ کے پوچھا "بائی جی کہاں ہیں؟"

"وہ تو باہر گئی ہیں" نوکر حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ گویا کہہ رہا ہو کیا آپ کو معلوم نہیں کہ وہ ہر روز شام کو اس وقت گھر سے باہر چلی جاتی ہیں۔ اور صبح سویرے لوٹ کر آتی ہیں۔ جب آپ سیٹھ صاحب کے ساتھ کبھی کبھار تشریف لاتے تھے۔ اس وقت بھی آپ کو ہماری بائی جی کا یہ اصول معلوم تھا پھر آپ اس وقت یہ لایعنی گفتگو کیوں فرما رہے ہیں۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہی کمرہ تھا، وہی صوفے، گلدان، ریڈیو، گراموفون فلمی پرچے، اور خاکدان میں آدھے جلے ہوئے سگریٹ، ڈرائنگ روم سے خوابگاہ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ بستر کے اوپر میلے رنگ کا گاؤن پڑا تھا اور مسہری سے ایک ریشمی شلوار لٹک رہی تھی اور اس کا ازار بند دونوں جہان محبت ہار کے وہ جا رہا تھا نیچے بستر کی طرف، جس کے قریب ایک کاٹھ کا گھوڑا تھا۔ غالباً بچے کا ہوگا۔

میں نے نگاہ پھیر کر نوکر کی طرف دیکھا۔ کہو رام بھروسے کیسے ہو؟
وہ جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھ کے بولا "صاحب میرا نام اب رام بھروسے نہیں ہے۔ جان ہے۔"
"جان ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں۔ اور بائی جی بھی اب رام پیاری نہیں رہی وہ مس صوفیا کہلاتی ہیں۔"
"کیا بات ہے ؟"
جان کے غلیظ دانت باہر نکل آئے۔ ہنس کر بولا "سیٹھ جو اس مکان کا مالک ہے نا۔ وہ کرسچین ہے، سیٹھ برگانزا۔ یہ ساری کی ساری لین اُسی کی ہے۔ بڑا امیر آدمی ہے۔"
"اوہ" میں نے تھوک حلق کے اندر نگلتے ہوئے کہا اور مجھے خیال آیا کہ کبھی ہماری سڑک جہاں ہمارا مکان ہے اس کا نام بھی اکبر روڈ تھا اور پھر جان میلکم روڈ ہو گیا۔ آج کل پھونگی لال چونگی لال روڈ ہے۔ جب مالک بدل جاتے ہیں تو ملکیت کا نام بھی بدل جاتا ہے۔ غلامی اسی طرح رہتی ہے۔
جان نے پوچھا۔ "آپ چائے پئیں گے ؟"
"نہیں" میں نے جواب دیا۔
"کوئی ٹھنڈا ونڈا ؟"
"نہیں۔"
"انہیں پڈنگ کھلاؤ۔" یہ ایک چھوٹا سا لڑکا بول رہا تھا۔ عمر مشکل سے چار سال کی ہوگی۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہی سنہرے بال، فراخ ماتھا، بھوری

آنکھیں اور موٹے ہونٹ، میرے دوست کا بیٹا۔ خاکی نکر اور گلابی قمیض پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اُسے اپنی گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگا۔

لڑکے نے کہا۔ کیا تم ممّی کے دوست ہو؟

میں نے رُک کے کہا: "ہاں" اور کہتا بھی کیا۔

لڑکے نے کہا۔ "ممی گھر پہ نہیں ہیں۔ وہ رات کو بھی گھر پہ نہیں ہوتیں۔"

"کہاں جاتی ہیں" میں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

لڑکے نے ذرا تتلاتے ہوئے کہا "کا۔ کام پہ جاتی ہیں۔ صبح کو آتی ہیں" پھر ذرا توقف کرنے کے بعد بولا۔ "تصویر دیکھو گے۔"

"ضرور دیکھیں گے۔"

لڑکا میری گود سے اندر خواب گاہ میں گیا اور وہاں TIMES OF INDIA کا سالانہ نمبر اٹھا لایا اور پھر آکے میری گود میں بیٹھ گیا۔ پھر یکایک کچھ سوچ کے فوراً میری گود سے اُتر گیا۔ اور گھبرا کے بولا۔ "سگریٹ پیتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

وہ بولا۔ "میری ممی تو پیتی ہیں۔ یہاں تو سب پیتے ہیں۔ تم کیوں نہیں پیتے ہو؟"

میں نے پوچھا۔ "کیا تمہاری ممی سگریٹ پیتی ہیں؟"

وہ بولا۔ "ہاں سگریٹ پیتی ہیں۔ تم کو وہ ڈبہ دکھاؤں۔" وہ پھر گود سے اُتر کر اندر جانے لگا میں نے روک کر کہا۔ "نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آؤ تصویریں دیکھیں۔" بچہ ورق اُلٹنے لگا بڑے بڑے رنگین خوبصورت اشتہار تھے پہلا اشتہار گھڑیوں کا تھا۔

بچے نے کہا: یہ گھڑیاں ہیں۔ سب اچھی اچھی گھڑیاں ہیں۔ تمہیں کون سی پسند ہے؟" میں نے ایک چھوٹی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ"

بچہ بولا: "واہ یہ تو عورتوں کی گھڑی ہے۔ مردوں کی گھڑی تو یہ ہوتی ہے یہ بڑی والی۔ اچھا ہم تم کو یہی لے دیں گے۔"

بچہ اتنا کہہ کر ہنسنے لگا۔

اگلے ورق پہ پانڈز کی اسنو کا اشتہار تھا۔

بچے نے کہا: "میری ممی لسے لگاتی ہے۔ یہ بھی لگاتی ہے۔ تم میری ممی کو یہ کریم لاکے دینا اور یہ عطر کی شیشی بھی اور ایسا ہونٹوں کو لگانے والا بھی ... ..."

"لا دیں گے۔"

ورق الٹا گیا۔

یہاں پہ کاغذ کا اشتہار تھا۔ کینبڈ بن کاغذ کا اشتہار۔ یہاں پہ ایک گھنے جنگل کی تصویر تھی۔ جس میں تناور درخت کھڑے تھے۔

میں نے لڑکے پوچھا: "یہ کیا ہے۔"

وہ بولا: "یہ جنگل ہے نا۔ اس میں ٹارزن رہتا ہے۔ ٹارزن منہ پہ ہاتھ رکھ کر یوں چیختا ہے جیسے بلّی۔ ہاہا ہا۔ ٹارزن کو میں نے باندرہ سینما میں دیکھا تھا۔ ممی مجھ کو انکل کے ساتھ لے گئی تھی۔"

"انکل کون ہے؟"

"واہ تم انکل کو نہیں جانتے۔ انکل کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ لال لال آنکھیں ہیں۔ مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ ایک روز رات کو انکل ہمارے گھر پہ سو رہا

تھا"۔۔۔۔۔۔

میں نے گھبرا کر ورق اُلٹا۔ اس صفحہ پہ اورینٹ لائن جہازوں کی تصویر تھی۔ لڑکے نے کہا "یہ جہاز ہے۔ اسٹی مر۔۔۔۔۔ اسٹیمر۔۔۔۔۔ اسٹیمر چلتے ہوئے۔"

"ہاں جانتا ہوں" میں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ مجھے لا دو گے۔ مجھے تو بس ایسا ہی جہاز چاہیئے۔ اتنا بڑا ایسا سفید رنگ کا۔"

"اچھا لا دیں گے۔"

"کہاں سے لاؤ گے" لڑکے نے کہا۔

"میں نے کہا۔ "بازار سے لاؤں گا۔"

"اچھا" لڑکے نے کہا۔ "اچھا تو سمندر بھی ساتھ لانا۔"

"سمندر بھی ساتھ لائیں گے۔"

"کہاں سے لاؤ گے۔ سمندر بھی بازار میں بکتا ہے؟"

"نہیں۔ سمندر باندرہ ہل کے نیچے سویا رہتا ہے۔ ایک روز میں وہاں جاؤں گا۔ اور چُپ چاپ سمندر کے گلے میں رسّہ ڈال کے اُسے لے آؤں گا۔"

"ہاں۔ جیسے گھوڑے کو باندھ کے لے آتے ہیں نا ہا ہا ہا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلونگا۔" بچے نے خوش ہو کے کہا۔

"اچھا ہم دونوں چلیں گے" میں نے ورق الٹتے ہوئے کہا۔

بچے نے کہا۔ "ممی اور انکل مجھ کو کبھی باہر نہیں لے جاتے اپنے ساتھ۔ دوسرے بچے لوگ تو اپنی ممی کے ساتھ باہر جاتے ہیں۔ کہو ا۔۔"

میں نے ورق الٹا۔ یہ فونٹن پن کی تصویر تھی۔ دو فونٹن پن تھے۔ ایک کی نب پتلی دکھائی گئی تھی۔ دوسرے کی نب موٹی تھی۔

لڑکے نے پوچھا "تمہیں کون سا قلم اچھا لگتا ہے؟"

میں نے کہا "موٹی نب والا۔"

"وہ کیوں؟"

"موٹی نب والا صاف ستھرا لکھتا ہے۔"

"اوہوں۔ چھوٹی نب والا بہت زیادہ لکھتا ہے۔ چھوٹی نب والا پن لینا سمجھے۔"

"سمجھ گیا۔"

"تو آگے چلو۔"

آگے ایک مضمون تھا فوجیوں کے متعلق، ایک تصویر میں ایک سپاہی وردی پہنے، ڈھول بجا رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

لڑکے نے جواب دیا "یہ میں ہوں ڈھول بجا رہا ہوں۔" دوسرے صفحے پر ایک آدمی پانی کی بالٹی بھر کے آ رہا تھا۔ لڑکے نے کہا "یہ ہمارا نوکر ہے۔" پھر اس نے جلدی سے ایک اور ورق الٹ دیا۔ یہاں پر وسکی کا اشتہار تھا۔

لڑکے نے چلا کے کہا "آہا۔ برانڈی۔ یہ برانڈی کی بوتل ہے۔ میری ممی برانڈی بھی پیتی ہیں۔" اس نے بڑے فخر سے سر اُٹھا کے کہا اور پھر مجھ سے پوچھا "تم بھی پیتے ہو۔ تو لاؤں، وہاں پلنگ کے نیچے رکھی ہے۔"

"میں نے کہا "نہیں۔ مجھے برانڈی اچھی نہیں لگتی کڑوی ہوتی ہے نا!"

لڑکے نے بڑے افسردہ انداز میں سر ہلا کر کہا "کڑوی چیزیں مجھے بھی اچھی نہیں لگتیں۔ یہ دیکھو میرے پیر میں زخم ہے۔"

لڑکے نے اپنا زخم دکھایا جس پہ ٹِن کچر آیوڈین لگی ہوئی تھی۔

لڑکے نے کہا "اس زخم میں بڑا درد ہوتا ہے لیکن ممی اس پہ ہمیشہ کڑوی دوائی لگاتی ہیں۔"

"کڑوی دوائی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولا "ممی ہمیشہ کڑوی دوائی لگاتی ہیں اس سے مجھے بڑا درد ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کوئی میرے زخم پہ میٹھی دوا لگا دے۔ شکر کی طرح میٹھی دوائی"

میں نے کہا "میں تمہیں وہ دوائی لا دوں گا۔"

بچے نے اپنے دونوں ننھے سے ہاتھ میری گردن پہ ڈال دیئے اور اپنے رخسار کو میری گردن سے مس کر کے بولا۔

"ضرور لا دینا۔ وعدہ کرو۔"

"وعدہ کرتا ہوں۔"

"اچھا تو میں تمہیں ایک بہت اچھی چیز دکھاتا ہوں۔ آنکھیں بند کر لو۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"آنکھیں کھولنا نہیں ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔" لڑکا خواب گاہ کے اندر جاتے ہوئے بولا پھر پلنگ کے نیچے سے ڈو پٹاخے چلانے والے پستول نکال لایا۔

اب وہ دو نوں پستول میرے سامنے تانے کھڑا تھا۔

ٹھاخ ٹھاخ! بچہ پستولوں کو چلاتے ہوئے زور سے چیخا۔ پھر اس نے پستولوں
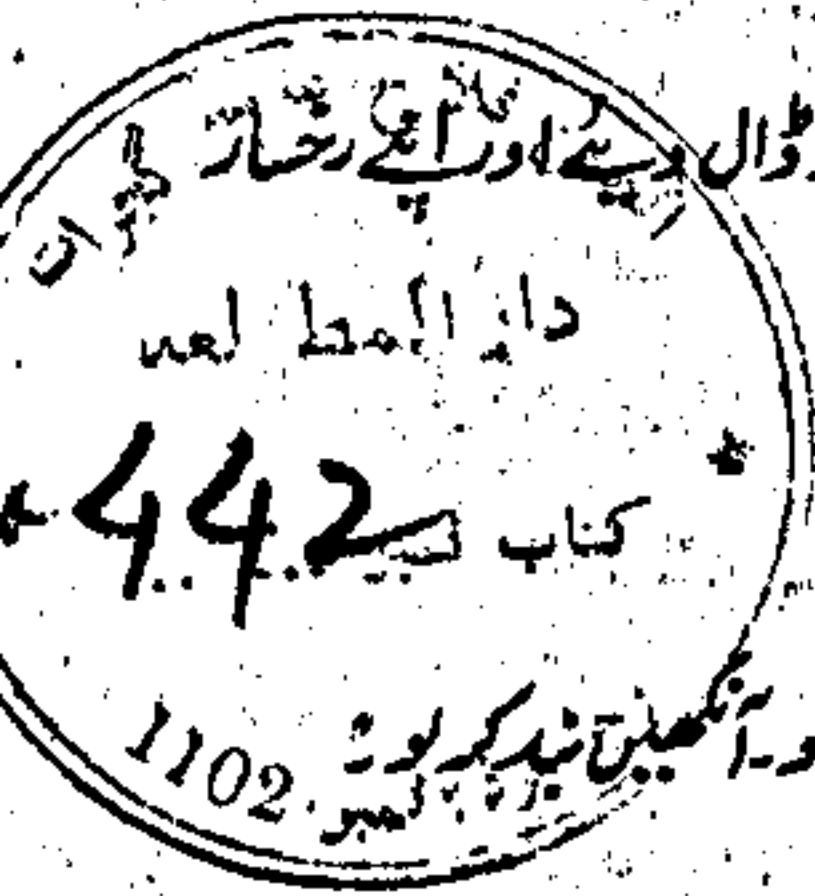
کو اپنی نیکر کی جیبوں میں ڈال لیا اور مجھے فوجی سلام کیا۔
میں نے اُسے سلام کیا؟"
وہ بولا "کبوتر دیکھوگے؟"
میں نے کہا "کہاں ہیں کبوتر؟"
وہ بولا۔ سو رہے ہیں اُدھر کبوتر خانے میں۔ ممی تو رات کو جاگتی ہیں اور دن کو سوتی ہیں مگر میرے کبوتر دن کو جاگتے ہیں اور رات کو سوتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب ہے اور ایک میم صاحب ہے"
میں نے کہا "میم صاحب کون سا کبوتر ہے"
"وہ سینہ پھُلا کے یوں چلتا ہے۔ وہ میم صاحب ہے ایک دن اس کی دُم سے بہت سارے انڈے نکلے۔ پتلے پتلے چھوٹے چھوٹے انڈے،
"میں نے ایک انڈا پھوڑ دیا اپنے ہاتھ سے۔ تو ممی نے مجھے پیٹا۔ ممی جب بہت برانڈی پی جاتی ہیں تو مجھے اکثر پیٹتی ہیں۔ یہ زخم پاؤں میں جو ہے نا۔ یہ ایسے ہی ہوا تھا۔ مگر ممی مجھ کو پیٹنے کے بعد پیار کرتی ہیں۔ چاکلیٹ کھانے کو دیتی ہیں۔ مگر ایک دفعہ ممی نے مجھ کو بہت پیٹا تھا۔ مگر وہ دوسری بات تھی"
"کیا بات تھی؟"
وہ بولا "کسی سے کہوگے تو نہیں"
"نہیں"
وہ بولا "میں گلی میں رہا تھا۔ وہ جو دھوبی کا لڑکا ہے نا جو ننگا رہتا ہے اور کالا سا ہے"

"ہاں ! ہاں !" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"میں اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے اس کی شیشے کی گولی چھین لی۔ وہ مجھے کہنے لگا ـــ گولی دے دو۔ میں نے نہیں دی۔ وہ کہنے لگا تو رنڈی کا بیٹا ہے۔ تو رنڈی کا بیٹا ہے۔ میں نے جب بھی نہیں دی۔ تو اس کی ماں نے مجھے ایک چانٹا مارا اور وہ گولی مجھ سے چھین لی اور بولی۔ چلا جا یہاں سے۔ رنڈی کا بیٹا۔ میں روتا ہوا گھر آیا تو ممی نے مجھے بہت مارا اور مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ رنڈی کا بیٹا کون ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو رنڈی کسے کہتے ہیں ؟"

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ میری زبان پہ جیسے تالے پڑ گئے تھے۔

بچے کے فراخ ماتھے پہ پریشانی جھلکنے لگی۔ اس کے موٹے ہونٹ نیچے لٹک گئے۔ جیسے وہ منہ بسور رہا ہو۔ آہستہ سے بولا "میری ممی تو اچھی ہیں۔ وہ رنڈی نہیں ہو سکتیں۔ میرے پاپا رنڈی ہوں گے۔ وہ تو کبھی ہمارے گھر نہیں آئیں گے۔ ضرور وہ رنڈی ہوں گے۔ میری ممی بولتی تھی وہ کبھی گھر نہیں آئیں گے کیوں نہیں آئیں گے ؟" اس نے میری طرف نگاہ پھیر کے پوچھا۔

میں نے جلدی سے نگاہ ہٹالی اور ٹائمز آف انڈیا کے ورق الٹنے لگا۔ ورق الٹتے الٹتے گاہکوں کا اشتہار سامنے آیا۔ ایک خوبصورت بچہ ہنس رہا تھا۔ لڑکے نے اسے دیکھ کر کہا "میں چاقو سے اس کا گلا کاٹ ڈالوں گا۔"

"وہ کیوں ؟"

"بس کاٹ ڈالوں گا۔"

میں نے پھر پوچھا "وہ کیوں ؟"

"یہ ــــ یہ ــــ میری طرف دیکھ کر ہنستا کیوں ہے؟" لڑکے نے آہستہ سے نفرت اور غصّے کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کے کہا۔ "یہ ہمیشہ میری طرف دیکھ کے ہنستا ہے۔" چھک چھک لڑکے نے ایک دم چاقو سے تصویر کو دو تین جگہوں سے کاٹ ڈالا ہنستے ہوئے بچے کی تصویر جگہ جگہ سے پھٹ گئی۔

میں نے بچے کو گود سے نیچے اتار دیا اور کرسمس ٹیبل کو بند کر کے میز پر رکھ دیا۔

لڑکے کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ اور وہ حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے نوکر کو آواز دے کر کہا۔ "رام بھروسے ۔۔۔۔۔ او ۔۔۔۔۔ جان ۔۔۔۔ جان"

"جی سرکار۔"

"میں جاتا ہوں بھئی۔"

"اچھا جی۔ تو ــــ تو بائی جی سے کیا کہوں۔"

یکایک میرے ذہن میں فیض کے دو مصرعے برق کی طرح کوند گئے۔

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

"میں نے آہستہ سے کہا۔ کیا کہو گے۔ کہہ دینا کوئی نہیں آیا تھا۔"

میں نے بچے کے سر پہ ہاتھ پھیرا جو ابھی تک چاقو لئے کھڑا تھا۔

لڑکے نے چاقو زمین پر پھینک دیا اور صوفے سے لگ کر سسکیاں لینے لگا ۔۔۔ "ممی۔ ممی۔۔۔۔۔ میں ممی کے پاس جاؤں گا۔"

میرے دوست! کیا میں تمہاری رنگین راتوں کی دل نواز کہانی لکھوں۔ یا اس

بچے کی کہانی جس کے گلے میں آج ہی سے پھانسی کا پھندا دیکھ رہا ہوں۔ جو اس وقت بھی چاقو ہاتھ میں لے گلیوں کے خوبصورت بچوں کا گلا کاٹ رہا ہے ؟

میرے دوست! میں جانتا ہوں کہ میری کہانی میں وہ مزہ نہیں ہے جو شراب کے پیگ، امساک کی گولی، اور رنڈی کی ٹھمری میں ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں میں نے ابھی اپنی کہانی کو کالے بازار میں نہیں بیچا ہے۔ جہاں تم نے میرے وطن کی سیاست، شہیدوں کی عزت، اور بیٹیوں کی عصمت بیچ کے شکر کی بل کھڑی کی ہے۔

میں بھی اپنا فن بیچ کے تمہاری زندگی پر شکر کا غلاف چڑھا سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرے سامنے تمہارا بیٹا ہے۔ اور میری کہانی اس کی نئی زندگی کے لئے لڑ رہی ہے۔

ایک غائبؔ

ایک بس شیو پُوری سے گوالیار جا رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ شیو پوری کے مقام پر لوگوں نے منع بھی کیا تھا کہ شام کے وقت شیو پُوری سے گوالیار جانے والی سڑک پر سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن بس میں جانے والے اکثر لوگ آج رات ہی گوالیار پہنچنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ڈرائیور کے ٹال مٹول کے بعد بھی اُسے بس چلانے پر مجبور کر دیا۔ بس میں پچیس آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ سب کے سب آج ہی گوالیار پہنچنا چاہتے تھے۔ اس بازار کے ایک "ڈھابے" سے کچھ کھا پی کے اور اِدھر اُدھر ٹہل کر کچھ لوگوں سے گفتگو کرنے کے بعد وہ لوگ شیو پُوری گوالیار کو رُخصت ہو گئے۔

بس پورگاؤں سے ابھی آدھ میل دُور ہی تھی کہ راستے میں سڑک پر پتھروں کا ایک بڑا پُشتہ سڑک کو روکے ہوئے نظر آیا۔ سڑک کے دونوں طرف ڈاکو کھڑے تھے

مجبوراً ڈرائیور کو بس روکنی پڑی۔
بس رُکتے ہی ہوا میں گولیوں کے فائر ہوئے اور پھر بس کو ڈاکوؤں نے ہر طرف سے گھیر لیا۔
کلیان سنگھ ڈاکو بس کے اندر داخل ہو کر کہنے لگا "تم میں سے آچرج برلا کون ہے؟"
ایک دُبلا پتلا سانولے رنگ کا مارواڑی جس کے ریشمی کُرتے پر سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے اور جو بے حد صاف شفاف دھوتی پہنے ہوئے تھا، کلیان سنگھ کی مشین گن کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔
"میں ہی آچرج برلا ہوں۔"
"تم اکیلے ہی ہو یا تمہارے ساتھی بھی ہیں؟" کلیان سنگھ نے پوچھا۔
برلا نے سیٹوں پہ بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ پوری بس میری ہے۔ ہم سب لوگ گوالیار جا رہے ہیں۔"
"تم سب لوگ نیچے اُترو ــــ!"
"مگر ــــ" آچرج برلا نے احتجاج کرنے کی کوشش کی کہ کلیان سنگھ نے مشین گن گھمائی۔ چند لمحوں میں سارے مسافر بس سے نیچے اُتر گئے۔
کلیان سنگھ نے گولیاں مار مار کر بس کے سارے ٹائر پنکچر کر ڈالے۔ پھر ڈرائیور سے بولا۔
"تیری اور کلینر کی جان بخشی کرتا ہوں لیکن تیری بس کا نمبر نوٹ کر لیا ہے۔ اگر تو نے کبھی پولیس کو خبر کرنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا!" کلیان سنگھ کی

آواز میں ایسی گہری دھمکی تھی کہ ڈرائیور نے وہیں ہاتھ جوڑ دیئے۔

کلیان سنگھ کے ساتھ دس ڈاکو تھے۔ انہوں نے سارے قافلے کو ایک پہاڑی راستے پہ چلنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ سب لوگ ڈرائیور اور کلینر کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

راستے بھر کلیان سنگھ نے اُن سے کوئی بات نہ کی۔ بس انہیں تیزی سے مختلف پہاڑی راستوں پہ چلاتا رہا اور بھول بھلیوں میں گھماتا رہا۔ آخری ایک گھنٹے کا سفر بس کے مسافروں نے ڈاکو کے کہنے پر اپنی آنکھوں پہ پٹی بندھوا کے کیا۔

رات کے کوئی آٹھ بجے کے قریب کلیان سنگھ اپنے دس ڈاکوؤں اور چھبیس مسافروں کے ساتھ اپنے اڈے پہ پہنچا۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ آج کا ڈاکہ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا ڈاکہ تھا۔ سب سے اہم! آج دوپہر ہی اُسے وائرلیس ٹرانسمیٹر سے شیو پوری سے اطلاع مل گئی تھی کہ سیٹھ گھنشیام داس برلا کا ایک رشتے دار سیٹھ اُچرج برلا اس بس سے سفر کر رہا ہے۔ کلیان سنگھ کو اس پہ کوئی حیرت نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ جب سے اس علاقے میں ڈاکوؤں کی سرگرمیاں بڑھی تھیں، اکثر بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار بھی اپنی کاروں میں سفر کرنے کے بجائے عام معمولی آدمیوں کی طرح بس میں سفر کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکوؤں کو بھی اس حقیقت کا پتہ چل گیا تھا اور انہوں نے موٹروں سے زیادہ بسوں پر اپنی توجہ مبذول کر دی تھی۔

سیٹھ اُچرج برلا ہندوستان کے سب سے بڑے سرمایہ دار سیٹھ گھنشیام داس برلا کا رشتے دار تھا۔ اب وہ اس پارٹی کو اغوا کر کے بہت آسانی سے

دس لاکھ روپے دھروا لے گا۔ ایک ہی داؤ میں! ـــــ کلیان سنگھ آج بے حد خوش تھا۔

جونہی ڈاکو اپنے اڈّے پر پہنچے۔ کلیان سنگھ کی بیوی اور اُس کی ساتھی پُتلی اپنے غار سے باہر نکل آئی۔ اُس کی گود میں ایک سال کا بچہ تھا۔ کلیان سنگھ نے اپنے بیٹے کا نام بہادر سنگھ رکھا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میرا بچہ بڑا ہو کر راجہ مان سنگھ سے بھی بڑا ڈاکو بنے گا اور اپنے باپ کا نام روشن کرے گا۔

پُتلی نے نام پُوچھا "کام بن گیا؟"

کلیان سنگھ خوشی سے اُونچی آواز میں بولا "یہ لا ہی نہیں اُس کے ساتھیوں کو بھی اُٹھا لایا ہوں۔ یہ لا سے کم سے کم دس لاکھ لوں گا! اور باقی تیئس مسافروں سے ملا جلا کر چار پانچ لاکھ اور ہو جائیں گے۔ ہندوستان کی سب سے امیر پارٹی کو گھیر کر لے آیا ہوں!"

کلیان سنگھ نے پُتلی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "اس کے بعد ہم سب لوگ ریٹائرڈ ہو جائیں گے۔ پھر ڈاکے ڈالنے کی ضرورت نہ رہے گی۔"

"تمہارے مُنہ میں گھی شکر!" پُتلی بائی مسرت سے بولی۔

کلیان سنگھ کی طرف دیکھ کر ایک سال کے بہادر سنگھ نے خوشی سے ہاتھ پھیلا دیئے۔ کلیان نے اپنے بیٹے کو باہوں میں لے لیا اور اُسے چُومتے ہوئے اغوا شدہ مسافروں کی طرف چلا۔

اچھے نج برلا اپنی سونے کی انگوٹھی جس میں نیلم کا نگینہ جڑا ہوا تھا اپنی انگلی پر پریشانی سے گھما رہا تھا۔ جب کلیان سنگھ نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

"تم ہی اُچرج برلا ہو نا ؟"

"ہاں ۔"

"سیٹھ گھنشیام داس برلا کے رشتے دار ؟"

"جی ہاں ۔"

"وہ تمہارے دستخط پہچانتا ہے ؟"

"ہاں کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی رہتی ہے ۔"

"تو تم آج ہی اُسے اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھو اور جب تک اُس خط کا جواب نہ آئے ، تم سب لوگ میری قید میں رہو گے !"

"خط میں کیا لکھوں ؟" اُچرج بولا اور جیب سے قلم نکالا ۔

"لکھو کہ تم ڈاکوؤں کی قید میں ہو ۔ رہائی کے لئے دس لاکھ روپیہ دینا ہوگا آج سے ٹھیک پانچ دن شیو پوری میں !"

اُچرج برلا نے قلم رکھ دیا ۔ بولا ۔ "آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے ۔ وہ میرے لئے دس لاکھ کیا دس روپے نہ دے گا ۔ میرا اُس کا جھگڑا ہے ۔ وہ مجھے بزنس میں ڈالنا چاہتا تھا لیکن میں نے کہا میں کوتا کروں گا ۔"

"تم ـــــ تم ؟" کلیان سنگھ حیرت سے بولا ۔ "تم کوی ہو ؟"

"ہاں ۔" اُچرج بولا ۔ "اپنے خاندان میں میں اکیلا کوی ہوں ، اور صرف میں ہی کوی نہیں ہوں ۔ میرے ساتھ یہ چودہ مسافر جا رہے ہیں یہ سب کوی ہیں ۔ ہم لوگ اس بس میں گوالیار جا رہے تھے ایک کوی سمیلن میں شامل ہونے کے لئے ..."

"اور یہ باقی تو لوگ کون ہیں ؟" کلیان سنگھ کی آواز کے سُر ایکدم گر گئے تھے ۔

اس سے پہلے کہ اُچرج برلا کوئی جواب دیتا، کالے ہونٹوں اور گول داڑھی والا گوری رنگت کا ایک آدمی کالی شیروانی، چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے آگے بڑھا۔ اُس کی شیروانی پہ بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر کلیان سنگھ کو آداب بجا کر کہنے لگا۔

"حضور! اس خاکسار کو ماہر جونپوری کہتے ہیں۔" پھر اپنے باقی ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ استاد برکت علی مانکپوری ہیں۔ غزل میں ان کا جواب نہیں ہے۔ یہ سراج فرخ آبادی ہیں۔ یہ رجب علی برہانپوری ہیں۔ یہ رادھے کشن دھیرج... لمبی نظمیں کہتے ہیں اور ایسے دھیرج سے سناتے ہیں کہ مشاعرے میں سُنتے سُنتے لوگوں کو نیند آنے لگتی ہے۔ یہ ـــــ"

کلیان سنگھ نے اُسے روک کر کہا۔ "بس بس! یہ بتاؤ۔ تم کون ہو، کیا ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

"جی" ماہر جونپوری آداب بجا لاتے ہوئے بولا۔ "وہی عرض کر رہا ہوں میں۔ ہم لوگ اندور سے ایک مشاعرے میں شرکت کر کے آ رہے تھے اور اب آگرے کے ایک مشاعرے میں جا رہے تھے کہ شیوپوری کے مقام پہ ہماری بس فیل ہو گئی۔ بھلا ہو اُچرج برلا صاحب کا انہوں نے ازراہِ کرم ہمیں اپنی بس میں جگہ دے دی۔ کیا بتاؤں حضور! ہمارا آج کتنا نقصان ہوا ہے۔ ہمیں آج رات ہی مشاعرے میں پہنچنا تھا۔"

"اور ہمیں آج ہی رات کوی سمیلن میں۔" اُچرج برلا بولے۔

چتلی بائی کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ کلیان سنگھ کی مایوسی

دیکھنے کے قابل تھی۔ پتلی نے اُس کا بازو پکڑ کر کہا۔" اب جو ہو گیا۔ یہ بے چارے غریب کوی ہیں شاعر ہیں۔ ان سے ہمیں کیا ملے گا۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں آج کی رات آرام سے یہیں رکھو۔ صبح رخصت کر دینا۔"

پھر اُس نے آگے بڑھ کر بس کے مسافروں سے کہا۔

" آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ اطمینان سے کھانا کھائیے۔ اس کے بعد ملا جُلا کوی سمیلن اور مشاعرہ ہو گا۔ یہیں پر۔ صبح آپ کو حفاظت سے اُسی طرح رخصت کر دیا جائے گا، جس طرح آئے تھے آپ لوگ ذرا بھی فکر نہ کریں۔"

پتلی بھائی نے ایک تلہٹی میں چادریں بچھوا دی تھیں۔ گاؤ تکیے لگوا دیئے تھے۔ پان اور سگریٹ کا بھی بندوبست تھا۔ دو پیٹرومیکس بھی روشنی کی بہار دکھا رہے تھے مدتوں کے بعد پتلی بائی کو ایسی خوبصورت محفل نصیب ہوئی تھی۔ اس نے بھی دو تین چیزیں گا کے سنائیں۔ جنہیں کویوں اور شاعروں نے بہت سراہا۔

پھر ملا جُلا کوی سمیلن اور مشاعرہ شروع ہوا۔ پتلی بائی بیچ بیچ میں داد دیتی جاتی تھی اس کی دیکھا دیکھی باقی ڈاکو بھی داد دینے لگے اور اچھے شعروں پر جھومنے لگے۔ اچرج برلا حیرت زدہ ہو کر بولا۔

" بھئی کمال کر دیا آپ لوگوں نے! یعنی آپ لوگ ڈاکو ہو کر بھی بڑے بڑے قابل منسٹروں اور نیتاؤں سے بڑھ کر صحیح موقع پہ داد دیتے ہیں۔"

" واللہ! ایسے خوش ذوق لوگ تو میں نے دلی اور لکھنؤ میں بھی نہیں دیکھے!" ماہر جونپوری سر ہلا کے بولے۔

دو بجے کے قریب محفل برخاست ہوئی۔ آخری غزل ماہر جونپوری نے سنائی۔

ماہر جونپوری کے دو شعر پتلی کو بہت پسند آئے ؎

بڑے دلچسپ وعدے تھے، بڑے رنگیں دھوکے تھے
گلوں کی آرزو میں زندگی شعلے اُٹھا لائی!
بتاؤ تو اندھیروں کی فصیلوں سے پرے آخر
کہاں سے قافلہ گزرا کہاں تک روشنی آئی

پتلی بائی نے جھوم جھوم کر داد دی۔ پھر کہنے لگی۔ "ماہر صاحب! یہ شعر آپ کے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"مجھے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے۔" پتلی بائی سوچتے ہوئے بولی۔ "یہ شعر خورشید احمد جامی کے ہیں۔"

"شروع میں انہیں کے تھے۔" ماہر جونپوری فوراً بول اُٹھے۔ "بعد میں میں نے انہیں ہتیا لیا۔"

"کیا مطلب؟" پتلی بائی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"مطلب یہ کہ صرف روپے پر ڈاکہ نہیں پڑتا۔ شعروں پر بھی ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ کوئی حسن کا ڈاکو ہوتا ہے۔ میں شعروں کا ڈاکو ہوں!"

پتلی بائی نے عجیب اُداسی سے سر ہلا کے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے ڈاکہ زنی زندگی کے ہر شعبے میں ہوتی ہے۔"

"بجا فرمایا محترمہ آپ نے۔ بجا فرمایا۔"

"پھر ہمیں ہی جیل میں کیوں ڈالا جاتا ہے؟ ہمیں ہی پھانسی کیوں دی جاتی

ہے ؟ پُتلی بائی نے جیسے ہواؤں سے پُوچھا۔

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب رات کے دو بج رہے تھے۔ محفلِ شعر و سُخن برخاست ہوئی۔ کلیان سنگھ نے گھڑی دیکھ کر پُتلی سے کہا۔ "اپنے مہمانوں سے کہو دو تین گھنٹے آرام کر لیں۔ صُبح سویرے ہی یہاں سے جانا ہوگا۔"

"لیکن ہمیں انہیں کچھ دینا بھی تو ہوگا۔" پُتلی بائی بولی۔

"ہمیں دینا ہوگا ؟" کلیان سنگھ حیران ہو کر بولا۔ "ہم تو ڈاکو ہیں۔ ہم تو لیتے ہی لیتے ہیں، دیتے کچھ نہیں۔"

"ہم ڈاکو ہیں۔ لیکن یہ تو کوی اور شاعر ہیں۔ اِن بے چاروں کا تو نقصان ہوا ہے۔ جس محفل میں پڑھنے جا رہے تھے۔ وہاں انہیں ان کی روزی ملتی۔"

"چلئے کوئی بات نہیں۔ وہاں نہ ہوا یہاں ہمارا کوی سمیلن ہو گیا۔"

اُچرج پرلا بولے۔ "ہمیں ایک کوی سمیلن میں حصّہ لینے کے ڈھائی سو ملتے ہیں۔"

پُتلی نے کلیان سنگھ سے کہا۔ "انہیں پانچ سو روپے ابھی دے دو اور ریل کا کرایہ الگ سے فرسٹ کلاس کا۔"

کلیان سنگھ نے حیرت سے پُتلی کی طرف دیکھا۔ پھر اس کا منشا سمجھ کے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جسے جتنا دینا چاہتی ہو، دے دو۔ انہیں خوش خوش رُخصت کرو۔"

جب چوبیس کویوں اور شاعروں کو اُن کی فیس سے دُگنے دام مل گئے تو وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔ یہ تو انہوں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا !

اُچرج پرلا بولے۔

"پتلی بائی جی! میرے خیال میں تو آپ سال میں ایک بار ہمیں ضرور یاد کیا کیجیے۔ ہم بہت اچھا کوی سمیلن کریں گے۔"

ماہر جونپوری نے کہا "اور ایک سالانہ مشاعرہ! میں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شاعروں کو لانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ شعر و ادب کے صحیح قدر دان تو ہمیں چنبل کی وادی ہی میں ملے!"

پتلی بائی ہنس کر بولی۔ "آپ کی تجویز بہت اچھی ہے۔ میں اس پر غور کروں گی۔ فی الحال تو آپ آرام کیجیے۔ صبحدم اُٹھ کر چلنا ہوگا۔"

صبحدم جب پارٹی اُٹھ کر چلنے کے لئے تیار ہوئی تو چلنے سے پہلے شاعر اور کوی جن گنے گئے۔ معلوم ہوا کہ چوبیس کے بجائے تئیس ہی کی گنتی ہے کون غائب ہے؟ معلوم کرتے کرتے پتہ چلا کہ ماہر جونپوری غائب ہیں!

انہیں اِدھر اُدھر غاروں میں ڈھونڈا گیا۔ وہ کہیں نہ ملے۔ آس پاس کی گھاٹیوں میں دیکھا گیا لیکن وہ کہیں نہ ملے۔

سراج فرخ آبادی بولے۔ "رات کو میرے قریب سو رہے تھے۔ صبح چار بجے کے قریب ذرا آہٹ سی ہوئی۔ میں نے دیکھا، ماہر صاحب دبے پاؤں باہر جا رہے ہیں۔ میں نے آہستہ سے آواز دے کر کہا "کہاں جا رہے ہو اُستاد؟ بولے۔ "ذرا رفع حاجت کے لئے جنگل جا رہا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے کسی شیر نے انہیں کھا لیا ہو۔" مائل بھوپالی بولے۔ مائل اور ماہر میں ہمیشہ چشمک رہتی ہے۔

"ہو سکتا ہے کسی پیڑ کے نیچے فکرِ سخن میں مشغول ہوں۔"

دھیرج جی نے دُوسری راہ سُجھائی۔

"کچھ بھی ہو آپ لوگ اب زیادہ دیر رُک نہیں سکتے"۔ کلیان سنگھ بولا: "خطرہ بڑھ جائے گا۔ میں آپ کو حفاظت سے سڑک تک پہنچا دیتا ہوں۔ آپ کے جانے کے بعد اگر وہ صاحب کہیں مل گئے تو انہیں بھی آپ کے بعد روانہ کر دیا جائے گا۔"

تینتیس کویوں گو شاعروں کا گروہ کلیان سنگھ کے دس ڈاکوؤں کے ساتھ پتلی بائی اور کلیان سنگھ کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گیا۔

اُن کے جانے کے دُو گھنٹے بعد ماہر جونپوری اپنے پٹے سنبھالے شعر گنگناتے اور اپنی ڈبیہ کھول کر مُنہ میں پان کی ایک گلوری رکھ کر نیچے جنگل سے آتے دکھائی دیئے۔

پتلی بھائی نے آگے بڑھ کر تہدیدی انداز میں اُن سے پوچھا۔ "کہاں چلے گئے تھے؟ یہاں چاروں طرف ڈھونڈنا پڑی۔ لیکن آپ کہیں نہ مِلے!"

"میں راستہ بھول گیا تھا۔"

"لیکن آپ گئے کیوں؟"

"میری عادت ہے۔ صبح سویرے شعر و سُخن کی فکر میں گھومنے نکل جاتا ہوں۔ ایک غزل کے دُو شعر ہوئے ہیں۔ واللہ! قیامت کے ہیں! بس دُو شعر ہوئے ہیں لیکن اکثر شاعروں کے پُورے دیوان پہ بھاری ہیں! اگر اجازت پاؤں تو عرض کروں۔"

"فرمائیے!" پتلی نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔ حالانکہ اس وقت اس کا جی ذرا بھی نہ چاہتا تھا کہ شعر سُنے۔

"عرض کیا ہے۔" ماہر جونپوری جُھوم کر بولے

"سحر کا، موسمِ گُل کا، غزل کا نام دینا ہے
تمہیں بھی خوبصورت سا کوئی الزام دینا ہے
ستارے شام تم اتنے قریب آئے کہ میں سمجھا
نگاہِ یار کا شاید کوئی پیغام دینا ہے

پُتلی بائی گوٹھوں پہ ہاتھ رکھ کر بڑی ادا سے مُسکرا کر بولی "کیا بات ہے، جالی سے آپ کی کوئی پُرانی دشمنی ہے؟ آپ نے آج پھر اُسی کی غزل چُرائی!"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ بہت اچھا شاعر ہے۔ ماہر مُسکرا کر کہنے لگے۔

"خیر اب میں آپ کو اس مقام پہ مزید ڈاکہ زنی کی ترغیب نہ دوں گی۔ آپ اب جلدی سے جانے کے لئے تیار ہو جائیے۔"

"کہاں؟ ماہر نے ابرو چڑھا کر پُوچھا۔

"جہاں بھی آپ کو جانا ہے۔"

"مجھے تو کہیں نہیں جانا ہے!" ماہر نے بے حد مستحکم لہجے میں انکار کرتے ہوئے کہا۔ "میری تو منزل آ گئی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ سال بھر مشاعروں میں گھومتا رہتا ہوں۔ کہیں سے پچاس ملتے ہیں۔ کہیں سے چالیس۔ کہیں یونہی ٹرخا دیا جاتا ہے، اور یہاں آتے ہی مجھے آپ نے ایک مشاعرے کے دو سو روپے دے دیئے! ایسے قدر دان مجھے کہاں ملیں گے۔ میں نے

تو ساری زندگی آپ کی خدمت میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے!"

"ارے؟" پُتلی بائی حیران ہو کر بولی۔

"جی ہاں۔ میں آپ کو شعر کہنا سکھا دوں گا۔ آپ مجھے رائفل چلانا سکھا دیجئے۔" ماہر نے ملتجی ہو کر کہا۔ "شعر و شاعری میں خاک دھرا ہے۔ زندگی بھر شبِ برأتی کے پیوند نہیں جاتے۔"

کلیان سنگھ ہنس کر بولا۔ "مگر ڈاکو کی زندگی کوئی اچھی زندگی نہیں ہوتی۔ اس کے عیش و آرام کی میعاد بہت مختصر ہے۔ آخر میں پھانسی کا تختہ ہے یا پولیس کی گولی!"

"کوئی بات نہیں!" ماہر جونپوری نے کہا۔ "مرنا تو ایک ہی دن ہے۔ لیکن آپ کے ہاں جب تک جئیں گے عیش و آرام سے تو جئیں گے۔ کیا بتاؤں کلیان سنگھ جی! اس ملک میں شاعروں اور کویوں کی وہ قدر نہیں ہے جو ڈاکوؤں کی ہے۔ بس مجھے آپ اپنی گینگ میں شامل کر لیجئے۔ زندگی بھر آپ کو دُعا دوں گا۔"

کلیان سنگھ نے پُتلی بائی کی طرف دیکھا۔ پُتلی بائی بولی۔ "پڑا رہنے دو بے چارا کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھار پُرانی عادت کی وجہ سے میرا جی بھی شعر سننے کو چاہتا ہے!!"

جشنِ حماقت

پچھلے کئی برس سے بمبئی میں جشنِ حماقت منایا جا رہا ہے۔ اس سال اس جشن حماقت کی صدارت کے لئے مشہور افسانہ نویس جناب کرشن چندر کو منتخب کیا گیا تھا۔ موصوف نے جو صدارتی خطبہ پڑھا وہ شائع کیا جا رہا ہے۔

مَیں نے سُنا ہے کہ یہ جشنِ حماقت کئی سال سے منایا جا رہا ہے مجھے شکایت تھی اور شکایت سے زیادہ حیرت بھی کہ اس سلسلے میں آج تک مجھے کیوں نظر انداز کیا گیا۔ کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے جلسے کی صدارت کا حق دار ہونے کی صلاحیت مجھ میں دوسروں سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے، اپنے مُنہ میاں مٹھو یعنی بدھو بننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ آج خود کو جشنِ حماقت کے صدر کی حیثیت میں پاتا ہوں تو میرا دل فخر و مُسرّت میرا مطلب ہے فخر و حماقت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ بالآخر میرے احمقانہ کارناموں کا اعتراف آج ہر احمق کو ہو گیا ہے ـــــ اس سے پہلے اپنا حق کیسے

پاتا ؟ —— ظاہر ہے پہلے کام دیکھا جاتا ہے پھر نام دیا جاتا ہے —— پچھلے سے پچھلے سال حکومت ہند نے مجھے پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا تھا، اس سال آپ نے حماقت کا تحفہ عطا کیا ہے، تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ان دونوں میں سے کون سا خطاب بڑا ہے ۔ اور آخر ان دونوں میں فرق کیا ہے ۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو غالب کے ایک مصرعے نے راہ سجھائی، جو کچھ اس طرح ہے ۔ ع

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی پدم بھوشن سے تو نجات حاصل کر سکتا ہے، مگر حماقت سے نہیں ۔ یہ وہ اعزاز ہے جو عمر کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

ابھی کچھ دن ہوئے سرکار نے مردم شماری کے پردے میں احمق شماری کروائی ہے کیونکہ احمقوں کی صحیح تعداد آج تک کوئی معلوم نہیں کر سکا ہے سُنا گیا ہے کہ حکومت کے زیرِ غور وزارت میں ایک شعبہ حماقت کے اضافے کا بھی ہے، لیکن اس سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس پورٹ فولیو کے لئے ۔ ہمارے بڑے بڑے نیتاؤں میں بڑی رسہ کشی چل رہی ہے جیسے دیکھئے اس پورٹ فولیو کو حاصل کرنے کے لئے اپنی اپنی حماقت کا ڈھنڈورا پیٹنے میں معروف ہے، حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ ہمارے نیتاؤں کے آپس میں بہت سے اختلاف ہو سکتے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ حماقت کے معاملے میں وہ ہمیشہ ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے رہے ہیں، یوں کہ جس شعبے کو بات لگائیے حماقت ہی کا شعبہ معلوم ہوتا ہے۔

یوں بھی سُنا ہے کہ کیبنٹ میں احمقوں کی خاصی کھپت کے بعد بھی ایک بڑی تعداد بڑے مستند احمقوں کی باقی بچ رہتی ہے ۔ اب کیا کیا جائے کیونکہ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ

احمق زیادہ ہیں اور پورٹ فولیو کم ہیں۔ راستہ یہ نکالا گیا ہے کہ ان میں سے چند حضرات کو محکمۂ سفارت کے سربراہ کی حیثیت سے دوسرے ملکوں بھیجا جانا طے کیا گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے اچھا بھی ہے، اب ملکی اور غیر ملکی حماقتوں کا تبادلہ بڑے پیمانے پر کیا جا سکے گا۔ ہوتا تو اب تک یہی رہا ہے، لیکن اب چونکہ ایک سوچی سمجھی حماقت کی بنا پر یہ تبادلہ ہوگا، اس لئے اس سے ایک احمق کو دوسرے احمق سے بہت کچھ سیکھنے کا سمجھنے کا موقع مل سکے گا۔ قیاس غالب ہے کہ بعض حکومتیں اس طرح کے احمقانہ مواقع فراہم کرنے میں بہت دلچسپی لیں گی، اور اس طرح حماقت کا پرچار ہوگا۔ بے ذوقی کا بیوپار ہوگا اور بے عقلی کا کاروبار ہوگا، اور ہمارے ملک کی حماقت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔

حماقت کا مسئلہ صرف سیاسی نوعیت کا نہیں ہے، وہ ادبی اور شعری نوعیت بھی رکھتا ہے، ورنہ آج کی مسندِ صدارت پہ آپ مجھے کیسے دیکھ سکتے ہیں ــــ صورتِ حال یہ ہے کہ ایک عرصے سے ہمارے ادبی اور شعری میدان میں حماقت کی چھین جھپٹ بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ جب ادیبوں اور شاعروں میں اس مسئلے پر بڑی تناتنی ہونے لگی، بات بڑھنے لگی، یعنی حماقت بڑھنے لگی تو طے کیا گیا کہ اس طرح تو کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ کیوں نہ سارے احمق آپس میں مل بیٹھ کے کوئی فیصلہ کر لیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ادیب اور شاعر کبھی مل بیٹھ کے کوئی فیصلہ کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ اس لئے جب حماقت کے حق داروں کی فہرست بنائی جا رہی تھی، اس وقت ادیبوں اور شاعروں میں جھگڑا ہو گیا۔ کوئی کہتا تھا میرا نام تم سے پہلے ہوگا، کوئی کہتا تھا میرا نام اس کے بعد نہیں ہوگا۔ اپنی بات کو صحیح منوانے کے لئے ادیبوں اور شاعروں نے حماقت کے میدان میں اپنے اپنے کارناموں کی تفصیل پیش کرنا شروع کی، اور یہ بھی سچ ہے کہ اپنی اپنی جگہ پہ ان

سب لوگوں نے اپنی حماقت حق بجانب ثابت کرنے میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ خیر جب احمقوں کی فائنل لسٹ تیار ہو کے آئی تو میرا نام سرفہرست تھا اور بریکٹ میں میرے نام کے ساتھ (احمقوں کا سردار) بھی لکھا تھا۔ میرا دل اپنی حماقت کی اس حوصلہ افزائی پر فرطِ حماقت سے باغ باغ ہو گیا۔ لیکن، میری اس بات سے علی سردار جعفری کو غلط فہمی ہو گئی۔ وہ سمجھے کہ سردار کا مطلب خود سردار جعفری ہیں۔ لیکن جب راجیندر سنگھ بیدی نے ایسی بے پناہ احمقانہ بات سنی تو وہ حیران رہ گئے، اور انہوں نے سردار جعفری سے کہا کہ بھائی ادیبوں میں تو بس ایک میں ہی سردار ہوں، آخر میرا یہ منصب مجھ سے کیوں چھینتے ہو۔ ابھی یہ گفتگو چل ہی رہی تھی کہ کچھ نئے ادیب اور شاعر یعنی کچھ نئے نئے احمق ہماری سبھا میں دخل دینے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب ہمارے ادب میں پرانے احمقوں کی جگہ نہیں ہے۔ اب ادب کے میدان میں ایک سے ایک بڑا اور شاندار احمق اتر چکا ہے، اور اب وقت آ پہنچا ہے کہ نئے احمق پرانے احمقوں سے دستارِ حماقت چھین کر اپنے سر پر سجا لیں۔ اس بات پر ہم جیسے پرانے احمقوں کو ظاہر ہے چپ ہونا پڑا۔ کیونکہ اس بات میں تو کسی بڑے سے بڑے احمق کو بھی شبہ نہیں ہے کہ نئی نسل کے احمقوں نے حماقت کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کے سامنے سارے پرانے احمقوں کی حماقتیں ہیچ ہیں۔

آیئے اب ذرا احمقوں کی قسموں پر بھی غور کر لیں۔ جیسے دنیا کی ہر شئے کی قسمیں ہوتی ہیں، اسی طرح احمقوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک احمق ریسرچ اسکالر کی دریافت کے مطابق احمقوں کی چند مشہور اور عام فہم قسمیں بیان کرتا ہوں۔ احمق موصوف نے اپنے تھیسس میں لکھا ہے۔

ایک احمق وہ ہوتا ہے جو پیدا ہوتے ہی احمق تسلیم کر لیا جاتا ہے اسے پیدائشی احمق

کہتے ہیں۔ دوسرا احمق وہ ہوتا ہے جو ہمیشہ یاروں کے طنز و مزاح کا نشانہ بنتا ہے اور جس کے بغیر کسی گھر، کسی محلے اور کسی محفل میں رونق نہیں ہوتی، اسے آرائشی احمق کہتے ہیں۔ ایک احمق وہ ہوتا ہے جو موقع بے موقع اپنی بیوی یا اپنے حاکم کی تعریف کرتا رہتا ہے اور لاکھ سمجھانے پر بھی باز نہیں آتا، ایسے احمق کو ستائشی احمق کہا جاتا ہے۔ پھر وہ احمق ہوتے ہیں جو ہر وقت اپنی حماقت سے بور کرتے رہتے ہیں اور جب تک ان کو ڈانٹا نہ جائے کبھی راہ راست پر نہیں آتے، یہ لوگ فہمائشی احمق کہلاتے ہیں۔ احمقوں کی ایک اور قسم وہ ہوتی ہے جو کوئی احمقانہ لطیفہ یا چٹکلہ سنانے کی خاطر ایک دوست کے گھر سے دوسرے گھر کی سڑک ناپتے پھرتے ہیں، ایسے لوگ پیمائشی احمق کہلاتے ہیں۔ پھر وہ حضرات ہوتے ہیں جو اگر ایک دفعہ آپ کے گھر میں تشریف لے آئیں تو دوبارہ کبھی جانے کا نام نہیں لیتے، ایسے لوگوں کو رہائشی احمق کہا جاتا ہے۔

ایک احمق وہ ہوتا ہے جو محض دوسروں کو خوش رکھنے کی خاطر اپنی حماقت میں دوسرے احمقوں کو بھی شامل کرتا رہتا ہے، ایسے لوگوں کو خوش باش احمق کہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اندر سے بالکل احمق نہیں ہوتے، بلکہ اپنی عقل مندی پر حماقت کا لبادہ اوڑھ کر محض شہرت حاصل کرنے کے لئے ہماری محفل میں گھس جاتے ہیں۔ ایسے لوگ سازشی احمق کہلاتے ہیں۔ مون سون کے دنوں میں آپ نے کچھ لوگوں کو بغیر چھاتے اور برساتی کے سڑکوں پر چہل قدمی کرتے دیکھا ہوگا، ہم انہیں بارشی احمق کہتے ہیں۔ پھر ایک احمق وہ ہوتا ہے جسے عوام کے اصرار پر مسند صدارت پر بٹھا کے اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو فرمائشی احمق کہا جاتا ہے۔ احمقوں کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو ہر جشن حماقت میں پانچ روپے کا ٹکٹ خرچ کر کے سب سے آگے کی کرسیوں پہ بیٹھ

جانتے ہیں، یہ لوگ نمائشی احمق ہوتے ہیں۔ احمقوں کی قسمیں کہاں تک بیان کی جائیں، سچ بات تو یہ ہے کہ اس دنیا میں جتنے آدمی ہیں اتنے احمق موجود ہیں۔ آج کل مرد اور عورت کے مساوی حقوق کا زمانہ ہے، اس لئے بغیر کسی ردّ و قدح کے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ حماقت کے میدان میں عورتیں مردوں کے برابر کی شریک ہیں، بلکہ اکثر اوقات ان پر بازی لے جاتی ہیں۔ یوں کہنا کہ عورت مرد کی نصف بہتر ہے، اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ عورت مرد سے بڑی احمق ہے۔ بلکہ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو حماقت کو صرف عورت کے پیدائشی حقوق میں شمار کرتے ہیں اور خلد سے آدم کے نکلنے کو بھی عورت کی حماقت پر مبنی سمجھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ امر اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ممکن ہے مردوں نے دوسرے شعبوں میں پہل کی ہو، لیکن حماقت کے میدان میں صرف عورت نے پہل کی ہے ــــ اس سلسلے میں زیادہ کچھ کہوں گا تو مناسب نہ ہوگا۔ آخر اس جشن کے بعد مجھے بھی تو گھر جانا ہے .. ..

آخر اس حماقت کے سلسلے میں ایک سنجیدہ بات کا ضرور ذکر کرنا چاہوں گا۔ آج کل حماقت کے مقابلے میں عقل مندی پر بہت زور دیا جانے لگا ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں عقل مندی کو فائق اور حماقت کو کمتر خیال کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ دھڑ کے دھڑی سے روپیہ کمانا عقل مندی ہے اور ایمانداری سے محنت کرنا حماقت۔ دوسروں کو لوٹ کے اپنی جیب بھرنا عقل مندی ہے اور کسی ضرورت مند کی حاجت روا کرنا حماقت۔ ایک ملک کی دوسرے ملک پر جارحانہ حملہ آوری عقل مندی ہے اور اپنے ملک کی چار دیواری کے اندر امن و چین سے بیٹھے رہنا حماقت۔ جس بات میں صرف اپنا فائدہ نظر آتا ہو اس پر عمل کرنا عقل مندی ہے اور جس میں دوسروں کے فائدے کا امکان ہو اس پر عمل کرنا حماقت ــــ اس عقل مندی کے پردے میں آج دنیا میں جگہ جگہ جنگیں ہو رہی ہیں۔ بے گناہوں

کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کا دور دورہ ہے۔ امیر پہلے سے زیادہ امیر اور غریب پہلے سے زیادہ غریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اے کاش اگر ہم اس عقل مندی کو چھوڑ کر چند لمحوں کے لئے احمق بن جایا کریں تو ہماری زندگی کس قدر معصوم خوب صورت، دلکش اور مسرتوں سے لبریز ہو جائے۔
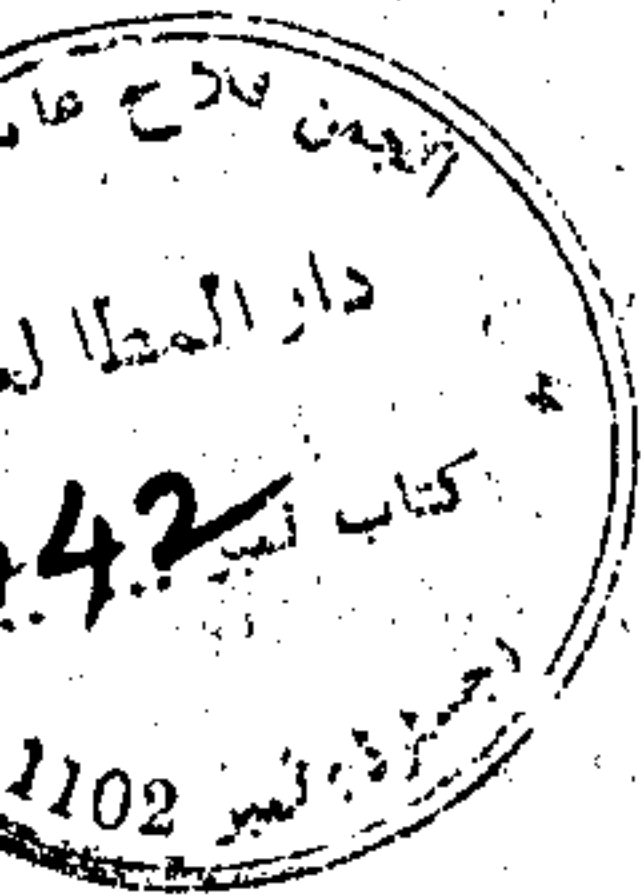
تھالی کا بینگن

تو جناب جب میرپور میں میرا دھندہ کسی طرح سے نہ چلا فاقے پر فاقے ہونے لگے اور جیب میں آخری اٹھنّی رہ گئی تو میں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ گھر میں تھوڑا سا آٹا بھی نہیں ہے کیا؟

وہ نیک بخت بولی " چار چپاتی کا ہوگا۔"

میں نے جیب سے آخری اٹھنّی نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔" جا بازار سے بینگن لے آ، آج چپاتی کے ساتھ بینگن کی بھاجی کھالیں گے۔" وہ نیک بخت بہت فکر مند ہو کر بولی۔" اس وقت تو کھالیں گے شام کے کھانے کا کیا ہوگا؟"

" تو فکر نہ کر وہ اوپر والا دے گا۔" میں نے کہا۔ پھر میری نظر شیشے کے اس بکس پر پڑی جس میں چھوٹا سا تاج محل رکھا ہوا تھا۔ یہ تاج محل میں نے اپنی بیوی کے لئے نئی نئی شادی کے دنوں میں آگرہ میں خریدا تھا۔ اور تاج محل کو دیکھ کر ہی خریدا تھا۔ محبّت بھی کیا

چیز ہے اس بیس روپے کے تحفے کو پاکر میری بیوی کا چاند سا مکھڑا گلابی ہو گیا تھا۔
اس وقت جب میں نے اس شیشے کے تاج محل کو دیکھ کر کہا: کچھ نہ ہوا تو اس کھلونے کو بیچ دیں گے۔" تو جناب اس کا چہرہ ایسا پیلا پڑ گیا جیسے کسی نے یکا یک اس کے چہرے کا سارا خون کھینچ لیا ہو، خوف مجبوری اور نا اُمیدی کے ملے جُلے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی: "نہیں میں اسے بیچنے نہ دوں گی یہ تو — یہ تو میرے سہاگ کی نشانی ہے۔"
میں نے اس کے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے بہت نرمی سے کہا " اچھا نہیں بیچیں گے اسے، کچھ اور بیچ دیں گے ہو سکتا ہے وہ اوپر والا کوئی اور سبیل پیدا کر دے، تو اس وقت جا کر بینگن تو لے آ بھوک سے مرا جا رہا ہوں"
وہ بازار سے بینگن لے کے آئی رسوئی میں بیٹھ کر اور سامنے لکڑی کے چھوٹے سے پڑے پر رکھ کر اس نے پہلا بینگن کاٹا ہی تھا کہ اسے اندر سے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔" ارے" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کیا ہے؟" میں رسوئی کے اندر گیا اس نے مجھے کٹا ہوا بینگن دکھایا "دیکھو تو اس کے اندر کیا لکھا ہے؟" میں نے غور سے بینگن کو دیکھا۔ بینگن کے اندر بینگن کے بیج کچھ اس طرح ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے کہ لفظ اللہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔" ہے بھگوان" میں نے اپنے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا: "یہ تو مسلمانوں کا اللہ ہے۔"
محلہ پوربیاں جہاں میں رہتا تھا MIXED محلہ ہے یعنی آدھی آبادی ہندوؤں کی ہے آدھی مسلمانوں کی۔ لوگ جوق در جوق اس بینگن کو دیکھنے کے لئے آنے لگے ہندوؤں اور کرسٹانوں کو تو اس بینگن پر یقین نہ آیا لیکن حاجی میاں اچھن اس پہ ایمان لے آئے پہلی نذر نیاز انہوں نے ہی دی۔ میں نے اس کٹے ہوئے بینگن کو اس شیشے کے بکس میں رکھ دیا جس میں تاج محل رکھا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک مسلمان نے اس کے پیچھے ہرا کپڑا بچھا

دیا۔ منّن میاں تمباکو والے نے قرآن خوانی شروع کر دی۔ پھر کیا تھا شہر کے سارے مسلمانوں میں اس بینگن کا چرچا شروع ہو گیا۔ جناب سمتی پورہ سے میمن پور تک اور بجواڑے سے کمائی گڑھ تک اور ادھر ٹیلا میاں کے چوک سے لے کر محلہ کوٹھیاران تک سے لوگ ہمارے بینگن کو دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ لوگ باگ بولے ایک کافر کے گھر میں ایمان نے اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ نذر نیاز بڑھتی گئی۔ پہلے پندرہ دنوں میں سات ہزار سے اوپر وصول ہو گئے جس میں سے تین سو روپے سائیں کرم شاہ کو دیئے جو چرس کا دم لگا کر ہر وقت اس بینگن کی نگرانی کرتا تھا۔

پندرہ بیس دن کے بعد جب لوگوں کا جوش ایمان ٹھنڈا پڑتا دکھائی دیا تو ایک رات جب سائیں چرس کا دم لگا کر بے سدھ پڑا تھا میں نے آہستہ سے اپنی بیوی کو جگایا اور رکھے ہوئے بینگن کے اوپر سے شیشے کا بکس ہٹا کر کہا دیکھو کیا دکھائی دیتا ہے۔ وہ بولی۔ "اللہ" میں نے کٹے ہوئے بینگن کا رُخ ذرا سا سرکایا اور پوچھا۔ اب کیا دکھائی دیتا ہے۔

"ادم۔ ارے یہ تو اُدم ہے۔" میری بیوی نے انگلی ٹھوڑی پہ رکھ لی۔ اس کے سارے چہرے پر استعجاب تھا۔ راتوں رات میں نے پنڈت دیال کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اسے بلا کر کٹے ہوئے بینگن کا بدلا ہوا رُخ دکھایا۔ پنڈت دیال نے چیخ کر کہا "ارے یہ تو ادم ہے ادم۔ اتنے دنوں تک مسلمان دھوکہ دیتے رہے۔" اس کی چیخ سُن کر سائیں کرم شاہ جاگ گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے وہ پھٹی پھٹی سُرخ آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا پنڈت رام دیال نے اسے لات مار کر کہا۔ "نکل یے۔ ہمارا دھرم بھرشٹ کرتا ہے ادم کو اللہ بناتا ہے۔"

بس پھر کیا تھا سارے شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ کٹے ہوئے بینگن

کے اندر دراصل "اُوم" کا نام کھدا ہوا ہے۔ پنڈت رام دیال نے چارج لے لیا رات دن آرتی ہونے لگی بھجن گائے جانے لگے چڑھاوا چڑھنے لگا۔ میں نے رام دیال کا حصّہ بھی رکھ دیا تھا کہ جو محنت کرے اسے بھی پھل ملنا چاہیئے، لیکن بینگن پر ملکیت میری ہی رہی۔

اب شہر کے بڑے بڑے سنت جوگی اور شُدھ مہاتما اور سوامی اس بینگن کو دیکھنے کے لئے آنے لگے جہاں اللہ نے اُوم بن کر اس کٹے ہوئے بینگن میں گویا مسلمانوں کو شکست دی تھی اور پانی پت کی تینوں لڑائیوں کا بدلا چکا دیا تھا۔ شہر میں جا بجا لیکچر ہو رہے تھے ہندو دھرم کی فضیلت پر دھواں دھار بھاشن دیئے جا رہے تھے شہر میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

ہندو کہتے تھے یہ اُوم ہے مسلمان کہتے تھے یہ اللہ ہے۔

اُوم !

اللہ !

ہری اُوم ست۔ اللہ اکبر۔ اگلے پچیس دنوں میں کوئی پندرہ بیس ہزار کا چڑھاوا چڑھا اور سونے کی انگوٹھیاں اور ایک سونے کا کنگن بھی ہاتھ آیا لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کا خمار پھر ڈھلنے لگا۔ تو جناب میں نے سوچا اب کوئی اور ترکیب لڑانی چاہیئے سوچ سوچ کر جب ایک رات پنڈت رام دیال بھنگ کے نشے میں دھت فرش پر لیٹے ہوئے تھے میں نے اپنی بیوی کو جگا کر کہا۔ "نیک بخت دیکھو اس شیشے کے بکس کے اندر کٹے ہوئے بینگن کے اندر تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے ؟"

"اوم ہے صاف اُوم ہے۔" میں نے اوم کا زاویہ ذرا سا اور سرکا دیا اور پوچھا "اب بتاؤ کیا دکھائی دیتا ہے ؟" وہ دیکھ کر گھبرا گئی۔ منہ میں انگلی ڈال کر بولی: "ہے

رام یہ تو کراس ہے کرسٹانوں کی صلیب ہے۔"

"ششش" میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "بس کسی سے کچھ نہ کہنا صبح تک چپ رہنا ہوگا۔ کل اتوار ہے کل صبح میں پادری ڈیوریںڈ سے ملوں گا۔"

کٹے ہوئے بینگن میں مسیحی صلیب کو دیکھنے کے لئے پادری ڈیوریںڈ اپنے ساتھ گیارہ عیسائیوں کو لے کر آئے اور بینگن کی صلیب دیکھ کر اپنے سینے پر کراس بنانے لگے اور عیسائیوں کے بھجن گانے لگے اور سر پہ جالی دار رومال اوڑھے خوب صورت فراک پہنے سڈول سی پنڈلیوں والی عورتیں اس معجزے کو دیکھ کر نہال ہوتی گئیں۔ شہر میں تناؤ اور بھی بڑھ گیا۔ ہندو کہتے تھے اس بینگن میں اوم ہے، مسلمان کہتے تھے اللہ ہے، عیسائی کہتے تھے صلیب ہے، بڑھتے بڑھتے ایک دوسرے پہ پتھر پھینکے جانے لگے۔ اکا دکا چھرے بازی کی وارداتیں ہونے لگیں سمتی پورہ میں دو ہندو مار ڈالے گئے اور مستری محلے میں تین مسلمان۔ ایک عیسائی شہر کے بڑے چوک میں ہلاک کر دیا گیا شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔

جس دن میری گرفتاری عمل میں آنے والی تھی اس سے پہلے دن کی رات میں نے بینگن کو موری میں پھینک دیا گھر کا سارا سامان باندھ لیا اور بیوی سے کہا: "کسی دوسرے شہر میں چل کر دوسرا دھندا کریں گے۔"

"تو جناب تب سے میں بمبئی میں ہوں۔ میرم پور کے ان دو مہینوں میں جو رقم میں نے کمائی تھی اس سے ایک ٹیکسی خرید لی ہے اب چار سال سے اس ٹیکسی کو چلاتا ہوں اور ایمانداری کی روزی کماتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں نے بار کی میز سے اپنا گلاس اٹھایا اور آخری گھونٹ لے کر اسے خالی کر دیا۔ یکایک میری نگاہ میز کی اس سطح پہ گئی جہاں میرے

گلاس کے شیشے کے پیندے نے ایک گیلا نشان بنا دیا تھا میں نے اپنے دوسرے ساتھی ٹیکسی ڈرائیور محمد بھائی سے کہا: "محمد بھائی دیکھو تو اس گلاس کے پیندے کے نیچے کیا نشان بن گیا ہے اوم ہے کہ اللہ؟"

محمد بھائی نے غور سے نشان کو دیکھا مجھے دیکھا پھر میری پیٹھ پہ زور سے ہاتھ مار کر کہا: "ابے سالے یہ بمبئی ہے یہاں نہ اوم ہے نہ اللہ نہ صلیب جو کچھ ہے روپیہ ہے بس روپیہ۔" اتنا کہہ کر محمد بھائی نے میز پہ ہاتھ پھیر کر پانی کے نشان کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔

میرا دوست

میرا دوست۔ لیکن میں اپنے کس کس دوست کا ذکر کروں۔ میرا دوست ایک تو وہ ہے جو ذرا شاعر مزاج ہے اور مجھ سے باتیں کم کرتا ہے۔ لیکن میری بیوی سے زیادہ باتیں کرتا ہے۔ کہیں آپ اس کا الٹا سیدھا مطلب نہ لے لیں۔ دراصل وہ بڑا ہی معصوم جانور ہے اور زیادہ تر میری بیوی سے متعلق ہی باتیں کرتا ہے۔ بڑی ہی معصوم بھولی بھالی باتیں ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر اسے معلوم ہے کہ میں کھانے میں کدو سے سخت نفرت کرتا ہوں۔ ہر وہ شے جو دیکھنے میں یا کھانے میں کدو سے مشابہت رکھتی ہے اس سے مجھے بڑی سخت نفرت ہے۔ چاہے وہ آدمی ہو یا سبزی ترکاری میرے دوست کو بھی اس کا اچھی طرح سے علم ہے۔ اسی لئے وہ بڑے ہی مسکین انداز میں میری بیوی سے کہتا ہے۔

"میں دیکھ رہا ہوں چند دنوں سے آپ کے خاوند کا چہرہ اترا سا ہے۔"
"بیوی کہتی ہے: "ہاں میں بھی کچھ ایسا محسوس کر رہی تھی۔"
"شاعر مزاج دوست کہتا ہے۔ "کہیں کچھ کھانے میں کوئی کمی تو نہیں؟"
"نہیں تو" بیوی اب کے بڑے بھروسے سے کہتی ہے۔

شاعر مزاج دوست سر ہلا کے کہتا ہے۔ "پھر ان کے چہرے کی رنگت سبزی مائل زرد کیوں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خوراک میں وٹامن نفی گ کی کمی ہے۔ ایک دفعہ میرے چہرے کی رنگت بھی اسی طرح کی ہو گئی تھی۔ تو —"

"تو —" میری بیوی جلدی سے پوچھتی ہے۔

تو میرا دوست بڑی خطرناک ملائمیت سے جواب دیتا ہے۔ "تو ڈاکٹر نے مجھے صبح و شام کدو کی بھاجی کھانے کو دی تھی۔ میں دوسرے ہی مہینے بھلا چنگا ہو گیا۔"

اب میری بیوی سر ہلا کر کہتی ہے۔ "مگر وہ تو کدو کھاتے ہی نہیں۔ اس لئے وٹامن نفی گ کی کمی کیسے پوری ہو گی۔"

"یہی تو مصیبت ہے بھائی!" میرا شاعر مزاج دوست افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کہتا ہے۔ "تم ان کی بے جا ناز برداری کرتی رہتی ہو اور ان کی صحت خراب ہوتی جاتی ہے۔ یہ وٹامن نفی گ کی کمی کیسے پوری ہو گی۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"کدو کھلاؤ"

"اور اگر وہ نہ کھائیں"

"کیسے نہیں کھائیں گے۔ تم کھلاؤ تو۔ ایک روز نہیں کھائیں گے۔ دو روز نہیں کھائیں گے۔ آخر جھک مار کر کھائیں گے۔"

چنانچہ اس مکالمے کے فوراً ہی بعد بندے کے گھر میں روز کدو کی بھاجی ٹیبل پہ دھری ہوتی ہے۔ کبھی کدو کا حلوہ کبھی کدو کا رائتہ کبھی کدو کا شوربہ اور کبھی کدو کا ملغوبہ، روز میز پر کسی نہ کسی صورت میں کدو دھرا ہوتا ہے جسے کھا کے اچھی بھلی رنگت سنہری مائل زرد ہو تی جا تی ہے بیوی مسکراتی رہتی ہے۔ لیکن آپ کو پتہ نہیں لگ سکتا کہ کدو کہاں سے آیا ہے۔ دوست اور دشمن کی پہچان ایک یہ بھی ہے کہ دشمن کی دشمنی کو آپ فوراً پہچان سکتے ہیں لیکن دوست کی دوستی کبھی نہیں پہچان سکتے۔ خصوصاً ایسا دوست جو آپ کی بیوی کے ذریعہ آپ کو کدو کھلانے کا عادی ہو۔

لیکن میرا دوست جو مجھے کدو کھلاتا ہے۔ اس دوست کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ جو مجھے غم کھلاتا ہے۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ کدو کھانے اور غم کھانے میں بہت فرق ہے۔ گو ذائقہ دونوں کا بُرا ہوتا ہے۔ پھر بھی کدو کھاتے کھاتے آپ کو ٹیپ دِق نہیں ہو سکتا۔ لیکن متواتر غم کھانے سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے میرا وہ دوست جو مجھے اکثر غم کھلاتا ہے۔ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

اس کی تکنیک ہی عجیب ہے۔ دوسرے دوست تو اس وقت گھر میں آتے ہیں جب میں گھر پہ ہوتا ہوں۔ وہ بالعموم اس وقت آتا ہے جب میں گھر پہ نہیں ہوتا ہوں۔ وہ بڑی جلدی میں تیز تیز قدم اٹھاتے اندر داخل ہوتا ہے اور آتے ہی

مجھے زور زور سے آوازیں دینے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ پھر ٹیبل پر پڑے ہوئے پھل دان میں سے سیب انگور ناشپاتی کھانے میں مصروف ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ میری بیوی سے باتیں کرتا جاتا ہے۔

"تعجب ہے ابھی تک نہیں آئے۔" وہ سوال کرتا ہے۔

میری بیوی کہتی ہے "اس میں تعجب کی کیا بات ہے وہ اکثر اس وقت گھر پر نہیں ہوتے۔"

"تعجب کی کیا بات ہے۔ مجھ سے تو اسی وقت ملنے کو کہا تھا۔ دوپہر کو سینما جاتے ہوئے ملے تھے۔"

"سینما کے اندر جاتے ہوئے؟" میری بیوی گھبرا کے پوچھتی ہے۔

"ہاں ہاں! میرا دوست انگوروں کا ایک گچھا منہ میں ڈال کے جواب دیتا ہے۔ "ان کے ساتھ میں غالباً آپ کی وہی رشتہ دار تھیں وہ جو جوان سی ہیں اور خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں۔ بال سنہری اور کٹے ہوئے۔"

"مگر میری تو کوئی ایسی رشتے دار نہیں ہیں۔" میری بیوی اور بھی گھبرا کر جواب دیتی ہے ــــــ "جو خوبصورت ہو، جوان ہو اور جس کے سنہری بال کٹے ہوئے ہوں۔"

میرا دوست آدھا سیب منہ میں ڈال کر کہتا ہے۔ "تو جانے دیجئے۔ کوئی اور ہوں گی ــــــ آجائیں گے سینما دیکھ کے وہ لوگ۔"

اس گفتگو کے بعد میرا دوست ناشپاتی کاٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور میری بیوی میکے جانے کے لئے سامان باندھنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی سسکیوں کی آہستہ آہستہ آواز، میرے دوست کے کانوں میں پڑتی ہے۔ اور آپ بڑی خندہ پیشانی سے انہیں درسِ حیات دینے لگتے ہیں۔

"گھبرائیے نہیں بھابی۔ زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"بھاڑ میں جائے ایسی زندگی۔"

"ممکن ہے بھائی مجھے دھوکا ہوا ہو۔"

"نہیں جی میں سب سمجھتی ہوں۔ وہ ہیں ہی ایسے۔"

"فرض کیجئے کہ ایسے ہیں۔ بھائی، پھر بھی انہیں راہِ راست پہ لانا آپ کا کام ہے۔"

"یہاں میں نے کوئی سکول نہیں کھولا ہوا ہے۔"

"بھائی آپ بھی غضب کرتی ہیں۔ آپ ہی نے انہیں ایسی ڈھیل دے رکھی ہے۔ ورنہ وہ یوں تباہ نہ ہوتے۔ سچ کہتا ہوں بھابی جب تمہاری صورت دیکھتا ہوں تو کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ کہنے کو تو وہ میرا دوست ہے۔ مگر میں اس کا یہ ظلم نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس کو ہزار بار سمجھاتا ہوں مگر کیا کروں، وہ میری سُنتا ہی نہیں۔ کم بخت ظالم۔ بد معاش۔"

اور وہ ـــــ میری بیوی رو رو کر کہتی ہے۔ "بس ان کے دوستوں میں تمہیں سب سے اچھے ہو۔"

"بھابی تمہاری جیب میں دس روپے ہیں۔" میرا دوست بڑی معصومیت سے پوچھتا ہے۔

اور پھر وہ دس روپے لے کے چلا جاتا ہے۔ اور جب میں گھر آتا ہوں، اور دیکھتا ہوں کہ گھر میں بجلی فیل ہو چکی ہے اور موم بتی کی روشنی میں دسترخوان پہ سیب کے ٹکڑے پڑے ہیں اور میری بیوی میکے چلی گئی ہے۔ تو میں فوراً سمجھ جاتا ہوں۔ کہ میرا دوست آیا ہوگا۔ وہی جو ہمیشہ میری غیر حاضری میں آتا ہے۔ اور دس بیس روپے لے کے میری بیوی کا اسباب بندھوا کے اسے میکے بھیج دیتا ہے۔ دوست اور دشمن کی پہچان ایک یہ بھی ہے۔ کہ دشمن مردانہ وار آپ پر حملہ کرتا ہے۔ دوست "زنانہ وار" بھی آپ پر حملہ کر سکتا ہے۔!

لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ اس طرح دس بیس روپے کھونے سے میرا زیادہ نقصان تو ہو نہیں سکتا۔ لیکن گھبرایئے نہیں اس کے لئے میرا دوسرا دوست موجود ہے جو اس کام کو وہاں سے شروع کرتا ہے جہاں سے میرے پہلے دوست نے اسے نامکمل چھوڑا تھا۔ دوست اور دشمن کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ دشمن دشمن کی مدد نہیں کرتا۔ لیکن دوست دوست کی مدد ضرور کرتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سچا دوست وہی ہے جو مصیبت میں مدد کرتا ہے۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ سچا دوست نہ صرف مصیبت میں مدد کرتا ہے۔ بلکہ وہ مصیبت بھی خود ہی لاتا ہے۔ اور ایک مصیبت ہی نہیں بلکہ بہت سی مصیبتیں اکٹھی کر کے لے آتا ہے تاکہ مدد کرنے میں آسانی رہے۔

ایک اسی قسم کا سچا دوست میرا دوست ہے جو مجھے اکثر کوئی نہ کوئی نیا بزنس شروع کرنے کے لئے کہتا رہتا ہے۔

مثال کے طور پہ ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا۔" بھئی تم ہاتھ پہ ہاتھ کیوں

دھرے بیٹھے رہتے ہو۔ کوئی بڑا دھندا کیوں نہیں کرتے۔

"کیا کروں؟"

"فلم کا بزنس کرو۔ بڑا نفع ہے۔ بڑا دھندا ہے۔ وہ تم نے فلم دیکھی تھی بندر رکھشا بندھن ہیں۔ اس میں پروڈیوسر کو ڈھائی کروڑ کا فائدہ ہوا۔"

چنانچہ ہم نے اپنے دوست کی باتوں میں آکے سات لاکھ کا نقصان کر ڈالا بڑا دھندا تھا۔ اس لئے سب کو فائدہ ہوا سوائے ہمارے۔ اب ہمارے دوست نے کہا: "دراصل دوست بڑے دھندے میں بڑا خطرہ ہے۔ اب تم چھوٹا دھندا کرو۔"

"کون سا چھوٹا دھندا کروں؟"

"بھئی پان کی دکانیں بہت سی خرید ڈالو۔ ہر نکڑ پر شہر میں ایک پان کی دکان تمہاری ہو جائے اور ہر دکان پہ تمہارا اپنا نوکر ہو۔ کوئی ایک پچاس، سو دکانیں کم از کم کھول لو۔ چھوٹا سا دھندا ہے۔ ہر دکان سے روز پانچ روپے نفع آتا ہے۔ سو دکانوں کا پانچ سو روپیہ روز آئے گا۔ سال بھر کا تم حساب کر لو۔"

بڑا خوبصورت سا دھندا تھا۔ سال بھر کے بعد حساب کیا۔ معلوم ہوا کہ اس سے تو فلم کا دھندا اچھا تھا۔ بندر رکھشا بناتے بناتے بنارسی پان بیچنے لگے۔ معلوم ہوا شہر کے بیچ میں جو بڑا ہوٹل اپنا تھا وہ اب اپنا نہیں ہے اور موٹر دوست نے گروی رکھ لی ہے۔ اور اب وہ اس کے اسٹیرنگ وہیل پہ سر جھکا کے مجھ سے کہتا ہے: "دوست یہ سب دھندے پرانے ہو چکے۔ اب کوئی نیا دھندا کرو۔"

"کون سا نیا دھندا؟"

"پلاسٹک کی چوڑیاں تیار کرو۔"

چنانچہ اب کے میں نے نیا دھندا کیا۔ یہ میرا آخری دھندا تھا۔ میں نے پلاسٹک کی چوڑیاں تیار کیں۔ اور پھر انہیں پہن کر اپنے گھر بیٹھ گیا۔ اب چھوٹے بڑے نئے پرانے سب دھندے ختم ہو چکے۔

لیکن گو دھندے ختم ہو جاتے ہیں۔ دوست کبھی ختم نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوست اور دشمن کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ آدمی دشمن کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن دوست کا مقابلہ کسی حالت میں نہیں کر سکتا۔ یہ وضعداری کے خلاف ہوگا۔ اس کا تجربہ مجھے اپنی تازہ ترین علالت کے دوران میں ہوا۔ کیونکہ جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے۔ جب سب دھندے ختم ہو جاتے ہیں تو بیماری شروع ہو جاتی ہے۔ اب کے مجھے میرے ڈاکٹر دوست نے بتایا کہ مجھے کچھ نہ ہونے کی بیماری ہے۔ آپ یہ سن کر ضرور حیران ہوں گے کہ یہ کچھ نہ ہونے کی بیماری کیا ہوتی ہے۔ تو سنیئے بیماری دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو ہوتی ہیں۔ یعنی آپ کو سردی ہو گئی۔ مجھے گرمی ہو گئی۔ آپ کو پیچش ہو گئی۔ مجھے دق ہو گئی۔ آپ کو کوڑھ ہو گئی مجھے حیرت ہو گئی۔

. . . یہ ہوئیں ہونے کی بیماریاں۔ دوسری ہوتی ہیں نہ ہونے کی بیماریاں۔ جن میں کچھ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے جسم میں کیلشیم نہیں ہوتا ہے۔ تو آپ کو کیلشیم نہ ہونے کی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ لوہا نہ ہو تو لوہا نہ ہونے کی بیماری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وٹامن فاسفورس، نمک اور مٹی کا تیل نہیں ہوتا تو جسم کا STOVE بجھا بجھا سا رہتا ہے۔ چنانچہ اب کے میری تازہ علالت جسم میں آیوڈین کے نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ ڈاکٹر

نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مجھے ایک عُمدہ سا انجکشن دیا اور چلا گیا۔ اس کے بعد میری شامت آئی۔ میرا مطلب ہے میرا دوست آیا۔

میرا یہ دوست بڑا معصوم اور بھولا بھالا ہے۔ اس کا لباس ڈھیلا ڈھالا ہے اور وہ دیسی ٹوٹکوں کا متوالا ہے۔ گویا بالکل گڑبڑ جھالا ہے۔ وہ آتے ہی لمبوترا سا مُنہ بنائے میرے سرہانے بیٹھ کے مجھ سے پوچھنے لگا۔

"کیا تکلیف ہے دوست؟"

"جسم میں آیوڈین نہیں ہے۔"

"تو ٹنکچر آیوڈین پیو۔ میرے گھر پر رکھی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ٹنکچر آیوڈین پیتے نہیں لگاتے ہیں۔"

وہ بولا "میرے خیال میں گھوڑوں کو پلاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں گھوڑا نہیں ہوں۔"

وہ بولا۔ "معاف کرنا۔ میں بھول گیا۔ میں نے سمجھا۔ میں ریس کورس میں بیٹھا ہوں۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر تک وہ چُپ رہا۔ پھر سوچ سوچ کر بولا "میرے خیال میں تم ہلدی پیو۔ تو اچھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں ہلدی کا خیال کیوں آیا۔"

وہ بولا۔ "ہلدی اور آیوڈین کا رنگ ملتا ہے۔ اس لئے مزاج بھی ملتا ہوگا اور تاثیر بھی۔ اس لئے تم ہلدی ضرور پیو۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں سب سمجھتا ہوں دیکھو اب تم ضد نہ کرو۔ تم نہیں سمجھتے ہو میں تمہارے بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں۔"

میرے دوست میں یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ سب سمجھتا ہے اور میں کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا ہوں۔ وہ سب کچھ دیکھتا تھا اور میں کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ گو میرا دوست ڈاکٹر وید یا حکیم نہیں ہے۔ تو کیا ہوا۔ وہ نہیں ہے مگر اس کا دادا تو تھا۔ اور اس کے دادا جی کے بنائے ہوئے ٹوٹکے آج تک ہمارے گھر سے قبرستان تک چلتے ہیں۔ اس لئے اس نے اقرار کر کے مجھے ہلدی پانی میں گھول کر پلا دی۔ پھر میرے پیٹ پر ہلدی کا لیپ کر دیا۔ میری آنکھوں میں ہلدی کا سُرمہ لگا دیا اور میرے ماتھے پر ہلدی بکھیر کر مجھے اپنی دانست میں اگلے جہاں پہنچا کر مجھ سے رخصت ہو گیا۔ یہی سچے دوست اور دشمن کی پہچان ہے کہ دشمن آپ کی خوبیوں پر نگاہ رکھتا ہے اور آپ کی کمزوری پر حملہ کرتا ہے۔ دشمن کا وار کبھی نہ کبھی خالی چلا جاتا ہے ــــ لیکن دوست کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔

پرسوں میرا دوست اپنے خاندانی ٹوٹکوں کے طفیل مر گیا۔ اور مرتے وقت مجھے ایک بیوہ اور گیارہ بچے اور بہشت سے ملبے چوڑے فرشتے کی ذمہ داری سونپ گیا۔ وصیت میں میرے لئے اپنا پیارا خارش زدہ کتا بھی میرے حوالے کر گیا۔ آج کل میں روز اس خارش زدہ کتے کو نہلاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ دشمن کی دشمنی اس کے مرنے پر ختم ہو جاتی ہے لیکن دوست کی دوستی اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ بلکہ قیامت تک آپ کا ساتھ دیتی جاتی ہے۔

بھینی بھینی بدبو

حامدہ نے آنکھوں میں کاجل کی لکیر لگا کر دنبالہ کھینچا۔ پھر اپنے گلابی ہونٹوں پر ہلکا گلابی لپ اسٹک لگایا تاکہ ہونٹوں پر چمک آجائے اور وہ قدرتی رنگت لئے ہوئے معلوم ہوں۔ پھر اس نے لونگ کی خوشبو گردن اور شانوں سے لے کر کمر تک بکھیر دی۔ اس کے بعد اس نے طاؤسی ساڑھی پہن کر پیشانی پر سبز رنگ کی بندیا لگا کر جو اس نے اپنے حسن وجمال کا مشاہدہ کیا تو لانبی گردن سے سینے کے ابھار سے نیچے کمر کی تنگنائے تک اسے وہ ہوش ربا جلوہ نظر آیا کہ وہ خود اپنے حسن سے چند لمحوں کے لئے مرعوب ہو گئی۔ اسے یقین سا آگیا کہ آج کی دعوت میں وہ پھر سب مردوں کی نگاہوں کا مرکز بنے گی۔ وہ عورت ہی کیا جو صرف اپنے مرد کی خاطر سجے۔ اپنا مرد تو گھاس ہے جس کو اونچی ایڑی اٹھا کر وہ روز روندتی ہے مزا تو تب ہے کہ جب مسٹر سمیع اللہ کے دلکش ڈرائنگ روم کے سبزے اور

یاقوتی رنگ کے جگمگاتے ہوئے فانوس کے نیچے گفتگو کرتے ہوئے مرد یکایک چپ ہو جائیں اور ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہوئی حامدہ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں۔ محبت تو شادی شدہ زندگی کی چند روزہ علامت ہے۔ آگے یہ دیکھنا ہے کہ کون کس کو کہاں تک چلا سکتی ہے۔ آج بلاشبہ مسز سمیع اللہ کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی آدھی سے زیادہ عورتیں اس کی دشمن ہو جائیں گی۔

اس خیال سے حامدہ بے حد محظوظ ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر چکری لے کر آئینے میں اپنے آپ کو ہر زاویے سے دیکھا اور جب اپنے آپ کو ہر طرح سے کیل کانٹے سے درست پایا تو طاؤسی بروکیڈ کا پرس ہاتھ میں لے کر اپنے بیڈ روم سے آواز دیتی ہوئی نکلی۔

"ڈارلنگ تم تیار ہو؟"

ڈارلنگ جس کی گنجی کھوپڑی تھی اور مٹیالی رنگت تھی اور ذہنیت اس سے بھی زیادہ مٹیالی تھی اور رو پہلی دھاریوں والی بش شرٹ کے نیچے باٹل گرین رنگ کی ڈھیلی ڈھالی پتلون پہنے تھا۔ اپنا جبڑا کھجاتا ہوا آگے بڑھا۔ حامدہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ جیسے امیر کبیر عورتیں کتے کی زنجیر کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہیں اور بنگلے کے دروازے سے باہر نکل گئی جدھر گاڑی کھڑی تھی۔

مگر بنگلے سے نکلتے ہی اسے آس پاس سے بھینی بھینی بدبو آئی۔ صرف خوشبو ہی بھینی بھینی نہیں ہوتی بدبو بھی بھینی بھینی ہوتی ہے۔ جیسے کہیں گھنے جنگل میں نمدار گھاس کے اندر بہت سی لکڑیاں، پتے اور ٹہنیاں ایک دوسرے کے بوجھ تلے دبی ہوئی آہستہ آہستہ گل رہی ہوں۔ ایک ہلکی سی سڑاندھ جیسے میتھین گیس کی ہوتی ہے۔

حامدہ کے نتھنے نفرت سے کانپے۔

یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے ؟" اس نے شوہر سے پوچھا۔

شوہر نے اپنی ناک پر ٹکے ہوئے دبیز شیشوں والی عینک کو ٹھیک کیا اور بنگلے کے باہر کی موری کا معائنہ کیا۔

دس قدم چلنے کے بعد اسے سراغ مل گیا۔ کھلی موری کے موڑ پر ایک کتا مرا پڑا تھا۔ موری کے اندر اس طرح ٹیڑھے انداز میں کہ اس کا سر تو بنگلے کے باغیچے میں کھڑے کرسمس کے پیڑ کو دیکھ رہا تھا اور دھڑ سے لگی دم بنگلے کے دروازے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ بعض کتے مرتے ہوئے بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ انہیں کس طرف مرنا ہے کتوں پر ہی کیا موقوف ہے آدمی کون سے بہتر ہیں !

جانم موری میں ایک کتا مرا پڑا ہے۔ شوہر نے ایسی قطعیت سے کہا جیسے وہ شرلاک ہومز ہو یا سراغ رسانی کے محکمے کا افسر اعلیٰ ہو۔

حامدہ ناک پر رومال رکھے آگے بڑھی مگر چند قدم جا کے رک گئی کیونکہ مرے ہوئے کتوں کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ جوں جوں ان کے قریب جاؤ ان کی بدبو بڑھتی جاتی ہے گو بعض لوگ اپنی زندگی ہی میں یہ خاصیت حاصل کر لیتے ہیں۔

حامدہ چیخ مار کے پلٹی اور شعلہ بار نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

دیکھ کیا رہے ہو۔ اسے فوراً یہاں سے ہٹوا کر دور پھنکوا دو۔

شوہر نے اپنے آپ کو اس گاڑی کی طرح محسوس کیا جس کی بیٹری ایک دم ڈاؤن ہو جائے اس نے راہ چلتے دو تین غریب نظر آنے والے آدمیوں کو پکڑا اگر کسی

نے حامی نہ بھری بلکہ جس آدمی کے کپڑے سب سے زیادہ میلے کچیلے تھے اس نے اسے بتایا کہ وہ ریگزین کا سب سے بڑا بیوپاری ہے۔ اور شاہ گنج کے بازار میں اس کی سب سے بڑی دکان ہے اور سالانہ ڈھائی لاکھ انکم ٹیکس بھرتا ہے۔

اس کے بعد چند منٹ تک شوہر عجیب بے بس سا نظر آیا حالانکہ یہ صورت حال اس کے لیے کوئی نئی تو نہیں تھی اس نے آخر ہمت کر کے راہ چلتے دو تین خوش پوش لوگوں سے پوچھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے؟

ایک بولا ” میاں جس کام پر جا رہے تھے سیدھے ناک کی سیدھ ادھر چلے جاؤ بس“

دوسرا بولا ” اس کتے پر مٹی ڈالو اور اپنے آپ پر ڈی ڈی ٹی چھڑک لو یا اپنے آپ پر مٹی ڈالو اور کتے پر ڈی ڈی ٹی یعنی جیسا موڈ ہو ویسا کرو میں اس زندگی میں موڈ کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔

تیسرے آدمی کو جس نے اسے روکا تھا کتے کا دور سے ملاحظہ فرما کر کہا۔

یہ بیڈفورڈ ، نسل کا اصلی کولی کتا ہے۔ شریف النفس اور نجیب الطرفین ضرور کسی اچھے گھر کا ہے اسے یہاں سے ہٹاؤ گے تو ضرور کسی مصیبت میں پھنسو گے بہتر یہی ہے کہ پولیس کو ٹیلیفون کر دو اس کے وارثین آ کے خود لے جائیں گے۔

”اجی پولیس میں ٹیلیفون کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میونسپلٹی کے ڈاگ ڈیپارٹمنٹ کو فون کر دو وہ وین لا کر اٹھا کرنے جائیں گے“۔ پانچویں آدمی نے مشورہ دیا اور سیٹی بجاتا ہوا آگے بڑھ گیا اس کے پُر اعتماد لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ آدمی اپنے سوا باقی سب کو مشورہ دینے کا عادی ہے۔

بوڈو ایک عرصے سے دور کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور نیم سرخ آنکھیں دھندلا رہی تھیں اس نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا اس کے بیوی بچے بھی بھوکے تھے۔ چہرے پر چھ دن کی داڑھی تھی اور میلی پینٹ بائیں گھٹنے کے قریب سے گھس کر پھٹ گئی تھی۔ اس وقت وہ گھر سے یہ عہد کر کے نکلا تھا کہ شاہ گنج بازار میں کسی نہ کسی کا ملوچھ ڈھو کے کچھ کھانے کا سامان لے کر آئے گا۔

میاں بیوی دونوں کو مجبور دیکھ کر وہ اس وقت آگے بڑھا اور بولا۔ میں اس کتے کو یہاں سے ہٹا سکتا ہوں مگر بیس روپے لوں گا۔

پانچ روپے دے دیں گے ۔۔۔ کیوں؟ میاں نے پرامید نگاہوں سے حامدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پورے بیس لوں گا" بوڈو نے اطمینان سے کہا کیوں کہ وہ حامدہ کی بڑھتی ہوئی بے چینی دیکھ رہا تھا۔

اچھا دس دے دیں گے حامدہ پرس سے دس کا نوٹ نکال کر جھلاتی ہوئی بولی۔

"مگر اس کتے کو یہاں سے ہٹا کر دور کہیں پھینک دو۔"

بوڈو بولا ۔۔۔ کیتھولک جم خانے کی بغل میں جو میونسپلٹی کے ملبے کا ڈھیر ہے۔ وہاں پھینک کر آؤں گا۔

حامدہ نے اپنے شوہر سے کہا ۔۔۔ تم اس کے ساتھ جاؤ دیکھو وہاں تک پھینک کے آتا ہے کہ نہیں۔ بعد میں اس کو دس روپے ملیں گے۔"

مگر مجھے ایک رسی چاہیئے بوڈو بولا۔" اس سڑے ہوئے کتے کو میں گود میں اٹھا کر تو لے جا نہیں سکتا۔

بنگلے میں سب کچھ تھا مگر رسی نہیں تھی۔ سمجھ دار بیویاں آج کل گھر میں رسی نہیں رکھتیں کہیں شوہر خودکشی نہ کر بیٹھے۔ ناچار دو چار پائجاموں، دو تین پیٹی کوٹ کے ازار بند نکالے گئے تو کام چلا۔ اب آگے آگے بوڈو پیچھے پیچھے کتا ــــ کتے کے پیچھے شوہر ــــ اور شوہر کے پیچھے وہ میتھین گیس والی بدبو جس نے سارے محلے کو چونکا دیا تھا۔

اب بوڈو کے پاس دس روپے تھے حالانکہ اس نے صرف دو یا تین روپے کی خواہش کی تھی جب ہاتھ میں دس روپے آگئے تو کتے کی ساری بدبو اس کے بدن سے نکل گئی اور شراب کی میٹھی میٹھی بلکورے لیتی ہوئی خوشبو اس کے تن بدن پر چھانے لگی اس کی نیم سرخ آنکھوں کا گلگی غبار نارنجی امیدوں سے گہرا ہوتا گیا اور اس نے سیدھے شراب خانے کی راہ لی۔ پانچ روپے کی وہ بوتل لے گا۔ دو روپے کی مچھلی تین روپے وہ گھر لے جائے گا۔ اپنے بیوی بچوں کے کھانے پینے کے لئے مگر ایسے موقعوں پر جیسے کہ اکثر ہوتا ہے وہ دس روپے کی شراب پی گیا بلکہ ایک روپیہ اوپر سے ادھار رہ گیا۔

جیب جھاڑ کر جب بوڈو شراب خانے سے باہر نکلا تو باہر کی تیز چلنے والی خنک ہوا میں اس کا نشہ ہرن سا ہونے لگا۔ ارے یہ اس نے کیا کر دیا؟ وہ یہ دس روپے اپنے گھر لے جاتا تو تین دن اس کے بیوی بچوں کا پیٹ بھرتا اس کے بجائے وہ اکیلے ہی دس روپے کی شراب پی گیا۔

پیشہ ور شرابیوں کی طرح وہ دیر تک بے مقصد ٹہلتا رہا اور اپنے آپ کو گالیاں دیتا رہا۔ یکایک وہ چلتے چلتے رک گیا اسے محسوس ہوا کہ وہ اس وقت کیتھولک چرچ کے

کی گندگی کے سامنے کھڑا ہے اور وہ بدبودار کتا اسی طرح اس ڈھیر پر پھیلا ہوا مرا پڑا ہے
یکایک یوں کھڑے کھڑے اسے ایک عجیب ترکیب سوجھ گئی اس نے کتے کو بڑی
احتیاط سے اس گڑھیں لگے مختلف اوزار بند والی رسی سے کھینچا اور کھینچ کر راؤنڈ ایونیو کے
گمرڈ والے عالی شان بنگلے کی ایک ایسی کھڑکی کے سامنے پھینک دیا جس کے پٹ سڑک
کی طرف کھلتے تھے۔

یہ بنگلہ اور اس کی یہ کھڑکی اس نے بڑی احتیاط سے انتخاب کی تھی۔ بنگلے کے اندر
کوئی پارٹی چل رہی تھی اور جس کھڑکی کے نیچے اس نے مرا ہوا کتا رکھا تھا اس کے اندر سے
مسرت بھرے قہقہوں کی ملی جلی مردانہ اور نسائی آوازیں آرہی تھیں بلاشبہ جونہی مرے ہوئے
کتے کی بدبو اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے نتھنوں میں جائے گی وہ باہر جھانک کر دیکھیں گے
اور اسے سڑک پر چلتا ہوا دیکھ کر اسے بلالیں گے اس بار وہ بیس سے کم نہیں لے گا۔ رات
گہری جا چکی ہے سڑک پر آمدورفت تقریباً ختم ہو چکی ہے اس وقت کوئی جمعدار بھی نہیں مل
سکتا نہ فون کرنے پر میونسپلٹی سے کوئی وین آسکتی ہے۔ شاید اسے تیس روپے مل جائیں
اس وقت وہ سب لوگ اندر بیٹھے پی رہے تھے۔ یقیناً فراخ دلی سے کام لیں گے۔
وہ دیر تک اسی بنگلے کے آس پاس ٹہلتا رہا اندر سے برابر قہقہے سنائی دیتے رہے
مگر کسی کو کھڑکی سے باہر جھانکنے کا خیال نہ آیا رہی بدبو تو شراب کی بدبو اور مرے ہوئے
کتے کی بدبو میں کون سا ایسا زیادہ فرق ہے دونوں بدبوئیں عناصر کو گلانے سڑانے کے بعد
پیدا ہوتی ہیں ان میں کسی قدر مماثلت کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔

جب دیر تک کسی نے ادھر توجہ نہ دی تو وہ بے چین ہو کر خود کھڑکی کے پاس گیا اور
بے حد نرم طریقے سے کھڑکی کو کھٹکھٹایا اور بے حد نرم لہجے میں بولا "صاحب آپ کی

کھڑکی کے باہر ایک کتا مرا پڑا ہے۔

صاحب خانہ نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور فضا کو سونگھا پھر بولے "مرا پڑا ہے تو تمہیں کیا، تم اپنی راہ لو ہم صبح میونسپلٹی کو ٹیلیفون کر کے دین منگا لے گا اور کتا ہٹوا دے گا جاؤ۔ جاؤ۔۔۔۔ اتنا کہہ کر صاحب خانہ نے کھڑکی اس زور سے بند کی گویا بدبو کے اندر آنے کے سارے راستے بند کر دیئے۔

بوڑو نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا باقی سب بنگلوں میں اندھیرا تھا اور یہی اندھیرا اب اس کے دل میں چھا رہا تھا۔ ٹھٹھرے سے ماؤف ذہن میں جب اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اب وہ اپنے بیوی بچوں کے لئے کچھ نہیں لے جا سکے گا تو وہ لڑکھڑا کر مرے ہوئے کتے کے پاس بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔

پرہیز

میں نے دیکھا ہے کہ قدرت ہر حال میں اپنا توازن برقرار رکھتی ہے ہم نے زکام و نزلہ، بخار اور نمونیا کے لئے پنسلین ایجاد کی تو قدرت نے پنسلین کو مہلک بنا دیا اب اتنے لوگ نمونیا سے نہیں مرتے جتنے پنسلین سے مرتے ہیں۔

ہم نے اربوں روپے خرچ کر کے عالمگیر پیمانے پر ملیریا کو ختم کر دیا تو کینسر کا مرض وبائی صورت اختیار کر گیا، ہم نے تپ دق کا شافی علاج دریافت کر لیا تو دل کا عارضہ عام ہو گیا جسے دیکھئے اپنے سینے کے بائیں طرف ہاتھ رکھے متوحش نگاہوں سے ڈرا دبہا دکھائی دیتا ہے میرے دوستوں میں ہر چوتھا دوست دل کا مریض ہے۔ پہلے دل کی بیماری میں صرف آہ و بکا کی جاتی تھی۔ اب جان بھی جاتی ہے۔

دل کا عارضہ رنج و غم کرنے سے بڑھتا ہے، اسی لئے ساری دنیا کے ہارٹ اسپیشلسٹ یہی کہتے ہیں کہ اگر دل کے عارضے سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور لمبی عمر پانا چاہتے ہو تو رنج و غم

کو کبھی اپنے قریب نہ پھٹکنے دو، ہمیشہ خوش رہا کرو اس لئے اب میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔
گزشتہ سال میرے والد کا انتقال ہو گیا تو میں برابر مسکراتا رہتا۔ احباب تعزیت کو آتے
رہے مگر میں مسکراتا رہا نہ جانے انہوں نے کیا سمجھا مگر میں تو ڈاکٹر کے کہنے پر عمل کر رہا تھا۔
پھر چھ ماہ بعد میری خالہ محترمہ کا انتقال ہوا تو میں خوش رہنے کے لئے ایک پکچر ہاؤس میں
ایک عریبہ فلم دیکھنے چلا گیا۔ پرسوں میرے گھر میں آگ لگ گئی تو میں خوشی سے قہقہے لگانے
لگا۔ میری بیوی نے سمجھا شاید میں پاگل ہو چکا ہوں مگر جب میں نے اسے سمجھایا کہ میں پاگل
نہیں ہوں محض خوش ہوں اور خوش بھی اس لئے ہوں کہ اس سے عمر بڑھتی ہے تو اس
نے پاگل خانے لے جانے والی ایمبولینس واپس کر دی مگر میں دیکھ رہا تھا وہ ایمبولینس واپس
کر دینے پر کچھ خوش نظر نہیں آتی۔
فکر کو دور رکھنے اور دل کو ہمیشہ خوش رکھنے کے علاوہ آج کل ڈاکٹر لوگ اور خصوصاً
ہارٹ اسپیشلسٹ دل کی بیماری کے مریضوں یا ہونے والے مریضوں کو وزن گھٹانے
کا مشورہ بھی دیتے ہیں ڈاکٹروں کی رائے میں طویل عمر پانے کا ایک ہی نسخہ ہے۔ اپنا وزن
گھٹا دو! مجھے اس دلیل میں وزن نظر آتا ہے۔ کیونکہ میں نے سنا ہے، مجنوں لیلےٰ کے مرجانے
کے بعد بھی پچھتر برس زندہ رہا۔ میں نے سنا ہے اور فلموں میں بھی دیکھا ہے کہ اس کا وزن
اتنا کم تھا کہ جب اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو اس کے دوست اور احباب
محض ایک پھونک مار کر اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے
ایک بار زور کی پھونک لگ جانے سے وہ اپنی منزل سے کچھ دور دریا میں گر پڑا مگر
ڈوب نہ سکا کیونکہ اس کا وزن پانی سے کم تھا۔ پھر ایک مچھلی نے پھونک ماری اور وہ واپس
اپنے احباب کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا گریبان ہمیشہ چاک رہتا تھا کیونکہ اس کا تن ناتواں

کپڑوں کا بوجھ نہ سہار سکتا تھا لیلیٰ کے مرنے کے بعد مجنوں نے کئی بار مرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہا ڈوب وہ نہ سکا۔ زہر کھایا تو زہر بیال بن کر اس کے جسم سے نکل گیا۔ اس لئے کہ زہر کا وزن مجنوں کے وزن سے زیادہ تھا ایک بار مجنوں نے ایک کانٹے سے ایک پتلا دھاگا لٹکا کر پھانسی گلے میں لگا کر مرجانے کی سوچی۔ دس سال تک وہ اس دھاگے سے بندھا کانٹے سے لٹکتا رہا مگر اس کی جان نہ نکلی کیونکہ اس کا وزن دھاگے اور کانٹے دونوں سے کم تھا پھر ایک دن ایک لڑکے نے اس دھاگے کو مچھلی پکڑنے کا دھاگا سمجھ کر پانی میں لٹکا دیا۔ جہاں مجنوں کو ایک مچھلی نے نگل لیا لیکن وہ اسے ہضم نہ کر سکی کیونکہ ہضم کرنے کے لئے وزن چاہیئے اس لئے مجنوں پھر پانی کی سطح پر اگل دیا گیا لوگ جھاگ کہتے ہیں مگر میں نہیں جانتا۔ خدا جانے کہاں تک سچ ہے مگر سبھی دیوانے اور فرزانے بھی کہتے ہیں کہ مجنوں آج بھی زندہ ہے۔ کچھ لوگوں کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے اس کہانی میں اور کوئی صداقت ہو نہ ہو۔ اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ آدمی وزن گھٹانے سے دل کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ دوسرے عوارض اس پر اس لئے حملہ نہیں کرتے کہ انہیں حملہ کر کے ملے گا کیا؟ اس لئے درازیٔ عمر کی دعا کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنا وزن گھٹا لیا جائے۔

وزن گھٹانے سے پہلے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ وزن بڑھتا کیسے ہے پہلے یہ خیال عام تھا کہ وزن آپ ہی آپ بڑھتا ہے اور بچپن سے بڑھاپے تک ایک خاص مقدار اور رفتار سے بڑھتا ہے۔ پہلے یہ خیال عام تھا اب یہ خیال خام ہے اب ڈاکٹروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وزن خود بخود نہیں بڑھتا۔ زیادہ اور عمدہ کھانوں سے بڑھتا ہے جس گھر میں اچھا باورچی یا اچھا کھانا پکانے والی بیوی ہوگی۔ اس گھر کے مالک کو دل کا عارضہ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے یہ لازم ہے کہ اگر آپ دل کے عارضے میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے تو

ایسا باورچی یا بیوی لائیے جو کھانا پکانا نہ جانتی ہو۔ اس لئے آج کل طلاق عام ہو رہی ہے
اور پھوہڑ بیویوں کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔ اور اچھا کھانا پکانا اور اصلی گھی استعمال کرکے
اپنے شوہر کو کھلانا بیویوں کی خامیوں اور نقائص میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ پرسوں میں نے
اخبار میں ایک مقدمے کی روداد پڑھی جس میں شوہر نے اپنی بیوی پر زہر دینے کا الزام لگایا
تھا تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ بیوی اپنے شوہر کو اصلی گھی میں کھڑے مصالحے کا قورمہ تیار کرکے
کھلاتی تھی! عدالت نے مجرمہ کو چھ سال قید با مشقت کی سزا دی ہے۔ کیونکہ ملزمہ اپنے
شوہر کو اصلی گھی ہی نہیں کھلاتی تھی صبح ناشتہ میں ایک گلاس اصلی دودھ بھی زبردستی پلاتی
تھی تاکہ اس کے شوہر کا وزن بڑھ جائے اور وہ وزن بڑھنے سے دل کے عارضے میں مبتلا
ہو کر جلدی مر جائے لیکن آج کل کے جج عاقل اور دانش مند ہوتے جا رہے ہیں پہلے پوسٹمارٹم
پر ڈاکٹروں کی رائے طلب کی جاتی تھی۔ اب سنا ہے کہ عدالت فیصلہ سنانے سے پہلے اس
قسم کا وزن بڑھانے والے کیس پر ڈاکٹری رائے بھی لیتی ہے اور اسے ناطق سمجھا جاتا
ہے سنا ہے کہ آل انڈیا میڈیکل ایسوسی ایشن نے ایک ایسی تجویز حکومت کے سامنے رکھی
ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کو اصلی گھی کھلائے۔ اصلی دودھ پلائے اور مرغن کھانے کھلائے
اسے فوراً پھانسی دے دی جائے! لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وزن صرف اصلی گھی کھانے
اور اصلی دودھ پینے اور گوشت کے مرغن کھانوں ہی سے نہیں بڑھتا وزن دراصل غذا میں
نشاستہ کی زیادتی سے بڑھتا ہے اور نشاستہ آلو میں سب سے زیادہ ہوتا ہے جوں جوں
لوگ آلو زیادہ کھاتے جاتے ہیں وزن میں بھالو بنتے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر وزن کم
کرنا ہے تو آلو مت کھائیے۔ نشاستہ روٹی میں بھی ہوتا ہے اور ڈبل روٹی میں تو اصلی روٹی
سے بھی ڈبل ہوتا ہے اس لئے اسے ڈبل روٹی کہا جاتا ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے

روٹی سے اجتناب کیجئے۔ پہلے زمانے میں لوگ روزی روٹی کے لئے تگ ودو کرتے تھے
اور دونوں کو حاصل کر کے موٹے ہو کر مرجاتے تھے اب صرف روزی کے لئے تگ ودو
کیجئے اور روٹی کو بالکل ہی بھول جائیے۔ نشاستہ اس لئے بھی برا ہے کہ یہ انسان کے جسم
میں جاکر ایک کیمیاوی عمل سے شکر میں تبدیل ہوجاتا ہے شکر کی زیادتی سے ذیابیطس ہوتی
ہے جس سے اکثر قلب کا دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ نشاستہ انسان کے جسم میں پہنچ کر اس
قدر ناشائستہ ہو گا اس کا مجھے علم نہ تھا آج سے چائے میں شکر بند، مٹھائی بھی بند اور آئس کریم
بھی ختم۔

پروٹین بھی انسان کو موٹا کرتی ہے کیونکہ اس میں وہ اجزا ہوتے ہیں جو گوشت بناتے
ہیں۔ اس لئے زندہ رہنے کے لئے پروٹین کو بھی کم کرنا ہو گا۔ گندم میں پروٹین ہوتی ہے
سرخ گوشت میں پروٹین ہوتی ہے۔ سفید گوشت میں البتہ پروٹین کم ہوتی ہے۔ جیسے مرغی کا
گوشت یا مچھلی آج کل اچھی مرغی آٹھ روپے سے کم میں نہیں آتی اس لئے اگر آپ کی
تنخواہ دو سو پچاس روپے ہے تو اس میں سے دو سو چالیس روپے مرغی پر صرف کیجئے اور
دس روپے ہر ماہ بچا لیجئے اور جناب مہینے میں دس روپے کی بچت کچھ کم نہیں ہوتی فرض
کیجئے کہ آپ اس طرح سو سال زندہ رہیں اور ہر ماہ دس روپے بچاتے رہیں تو ذرا سوچئے
کہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کے کتنے رشتے داروں کا بھلا ہو گا۔

گٹھیا بھی دل کا دشمن ہے گٹھیا کا عارضہ جس میں جوڑوں میں درد ہوتا ہے اور وہ سوج
جاتے ہیں یہ ابتدا ہے دل کے دورے کی اور گٹھیا یورک ایسڈ کی زیادتی کی وجہ سے پیدا
ہوتا ہے یعنی جسم کا اندرونی نظام جسے انگریزی میں میٹابولزم کہتے ہیں۔ آپ ہی آپ یورک ایسڈ
زیادہ پیدا کرتا ہے۔ وہ ہیں دالیں، مٹر، مچھلیاں، سرخ گوشت وغیرہ یاد رکھئے کہ آپ شکر بند کر چکے

ہیں ، دودھ مکھن آپ پر حرام ہے اب سب طرح کی دالیں مع مٹر بند ہو چکیں تو پھر آپ کیا کھائیں گے ! غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے ۔ آرام اور اطمینان سے سوچئے کہ غم کھانے سے بھی عمر کم ہوتی ہے اور آپ لمبی عمر پانا چاہتے ہیں ۔

ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ آپ دن کو لوکی کھائیے اور رات پالک کا ساگ اور اصلی گھی کی جگہ سورج مکھی کے بیجوں کا تیل استعمال کیجئے ۔ بہتر یہ ہوگا کہ سورج کو بھی چھوڑ دیجئے صرف مکھی کا تیل استعمال کیجئے ، دن کو لوکی رات کو ساگ اسے میری موت دور بھاگ اور اگر آپ کو لوکی اور پالک کے ساگ اور سورج مکھی کے بیج کے تیل سے نفرت ہے تو صرف پانی پیجئے اس میں تھوڑا سا سنگترے کا رس ملا لیجئے دل کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اس لئے نمک بھی مت ملائیے ۔ اس کی جگہ سنگترے کا رس پانی میں ڈال کر دیجئے پھر اکیس دن کے فاقے کے بعد گاندھی جی بھی کیا کرتے تھے ۔ پانی اور سنگترے کا رس بس !

لمبی عمر پانے کا مجھے بھی بچپن سے شوق رہا ہے اور اچھے کھانے کا بھی بچپن سے شوق رہا ہے لیکن دونوں شوق ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے اس لئے میں نے وزن گھٹانے کے لیئے نشاستہ بند کر دیا اور وہ تمام روٹیاں اور سبزیاں بھی جن میں نشاستہ ہوتا ہے ، پھر میں نے مٹھائی کھانا بند کیا ۔ آئس کریم کو چھونے سے انکار کیا ، سرخ گوشت سے پرہیز ۔ آلو مٹر ، پھل والی بھاجی ۔ آہستہ آہستہ خوراک کم کرتے کرتے میں صرف پانی اور دو چمچے اورنج جوس پر آگیا ۔

دو ہفتے اس خوراک پر کسی نہ کسی طرح زندہ رہ کر جب میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے وزن تولنے والی مشین پر لا کھڑا کیا تو معلوم ہوا اس پرہیز کے بعد بھی میرا وزن دس پونڈ بڑھ چکا تھا ۔

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک خطرناک سنجیدگی کی لہر آئی سٹیتھسکوپ کو میرے دل پر رکھتے ہوئے بولا "کیا کھاتے رہتے ہو؟"

میں نے کہا "پانی میں تھوڑا سا اورنج جوس ڈال کر پیتا رہا ہوں"

"یہی تو خرابی ہے تم میں" ڈاکٹر میرے سینے کو اپنے انگوٹھے سے ٹھونکتے ہوئے بولا. وزن بڑھ گیا ہے. سنگترے کے رس میں بڑے قوی اجزا ہوتے ہیں. میرے خیال میں تم صرف پانی پیئو. ایک ہفتے میں تمہارا وزن کم ہو جائے گا. موجودہ حالت اور صحت بے حد خطرناک ہے تمہیں کسی وقت بھی دل کا دورہ پڑ سکتا ہے. اگلے ہفتے آنا"

گھر آ کر میں نے بیوی سے کہا کہ آئندہ سے میں صرف پانی پیا کروں گا اور محض پانی پی کر جیا کروں گا. صبح ناشتے میں ایک کپ پانی. لنچ پر ایک گلاس پانی. رات کو دو گلاس پانی ایک ہفتے میں وزن آپ ہی آپ کم ہو جائے گا. بیوی نے بھی خوش ہو کر اس پر صاد کیا. کیونکہ اس طریقے پر عمل کرنے سے کچن کا خرچ بہت کم ہو گیا تھا.

ایک ہفتے کے بعد جب میں پھر ڈاکٹر کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ محض پانی پینے سے میرا وزن دو پونڈ اور بڑھ چکا ہے. ڈاکٹر حیرت میں پڑ گیا بولا "تم نے کچھ اور تو نہیں کھایا پیا سچ سچ بتاؤ."

"مطلق نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ فون کر کے میری بیوی سے پوچھ سکتے ہیں"

پانی پینے کا گلاس صاف ستھرا تھا" ڈاکٹر نے پوچھا.

"جی ہاں سوڈے سے دھلوا دیا تھا" میں نے کہا ہمیشہ دھلواتا ہوں اور اپنے سامنے نل کا پانی نکلوا کر پیتا ہوں.

"پھر وزن کیوں بڑھ گیا؟" ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا.

میں نے کہا کہ جب آپ جانتے ہیں بمبئی کے پانی میں پانی کے سوا سب کچھ ہوتا ہے
نل کھولئے تو کبھی پانی کی پتلی دھار کے ساتھ مچھلی چلی آ رہی ہے. کبھی گھونگھے. کبھی چوہے.
کبھی کیکڑے. ایسی ایسی مقویات پائی جاتی ہیں کہ آدمی اگر اس پانی کو پیئے تو ناممکن ہے
کہ موٹا نہ ہو۔"

"تو آئندہ سے پانی چھان کر پیجیئے." ڈاکٹر نے بڑی سختی سے کہا سولہ روپے نکالو میری فیس کے۔"
میں نے سولہ روپے جیب سے نکال کے ڈاکٹر کی ہتھیلی پر رکھے اور گھر چلا آیا اور گھر آ کر
بیوی سے کہا کہ وہ میرے لئے ٹکڑے مصالحے کا گوشت تیار کرے. چکن، ریشمی کباب. تیتر
کے تکے. قیمے بھرے پراٹھے اور آخر میں ایک پاؤ آئس کریم، رات کو سونے سے پہلے بالائی والے
دودھ کا ایک گلاس بھرا ہوا جس میں بادام اور کشمش اور چھوہارے بھی پڑے ہوں۔
بیوی نے گھبرا کر کہا: "تمہارا کیا ارادہ ہے اپنی جان دینے کا؟ بارہ پونڈ وزن تمہارا پہلے
سے بڑھ چکا ہے اب صرف چھنا ہوا پانی پیئو بلکہ ابال کر پیئو۔" میں نے کہا مرنا تو ہر حال میں ہے
میں جیسے کہتا ہوں ویسے کرو۔" دوسرے دن میں نے اس سے کہا: "آج کے مینو میں تندوری
مرغ تلی ہوئی پام فریٹ، چکن بریانی اور لہسن سے بگھارا ہوا دہی کا رائیتہ اور آلو کے پراٹھے
اور بعد میں بنارس حلوائی والے کے ہاں سے موہن بھوگ کی ایک پلیٹ ادھر کھاتے میں
اصلی گھی استعمال ہو۔ ورنہ تازہ مکھن، سات دن میں نے اسی طرح کا پرہیز رکھا اور خوب
ڈٹ کر کھایا بیوی مسلسل احتجاج کرتی رہی اس نے اپنے میکے والوں کو خط لکھ دیا کہ وہ جلد
کوئی بری خبر سننے کے لئے تیار رہیں اور میرے تمام دوستوں کو خبردار کر دیا کہ انہوں نے
مجھے جو قرضے دے رکھے ہیں وہ جلد سے جلد اس کا چکتا کر لیں ورنہ بعد میں وہ اس کی ذمہ دار
نہ ہو گی۔

سات دن مرغن غذائیں کھانے کے بعد جب میں نے ڈاکٹر کے کہنے پر وزن تولنے والی مشین پر پاؤں رکھا تو میرا وزن بارہ پونڈ کم ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک مطمئن تبسم نظر آیا: "میں کہتا نہ تھا۔ موٹا کرنے والی وزن بڑھانے والی تمام اشیا چھوڑ دو۔ تمہارا وزن خود بخود کم ہو جائے گا۔ دیکھا آج وزن بارہ پونڈ کم ہے اور چہرے پر بھی رونق ہے جو احتیاط، پرہیز اور ڈاکٹر کا کہا ماننے سے آتی ہے۔" نکالو بتیس روپے۔

ہاتھ کی چوری

سویرے جو کل میری آنکھ کھلی، تو دیکھتا ہوں کہ میرا بایاں ہات غائب ہے۔ رات کو جب سویا تھا تو موجود تھا۔ بہت حیران ہوا، کہاں غائب ہو گیا ہے۔ بستر پر ادھر اُدھر ڈھونڈا کہیں نہ ملا۔ کہنی زور دائیں کہنی، مار کر بیوی کو جگایا۔ اس سے پوچھا: "بھلی مانس" تم نے کہیں میرا بایاں ہاتھ دیکھا ہے؟" وہ بولی کیا دایاں، کیا بایاں ـــ ہات تو تمہارے میں ایسے ایسے دیکھ چکی ہوں کہ اب تمہارے سارے ہتھکنڈوں سے واقف ہو چکی ہوں۔ اس وقت تم کون سے ہات کی صفائی دکھا رہے ہو؟"

میں نے کہا: "نیک بخت، میں ہات کی صفائی کیا دکھاؤں گا؟ میرا تو خود ہات غائب ہے۔ یقین نہ آئے تو خود دیکھ لو!"

اس پر چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ میرا بایاں شانہ ٹٹول کر کہنے لگی۔

"واقعی غائب ہے ایسے لگتا ہے جیسے کبھی تھا ہی نہیں!"

پھر میری طرف شبہ بھری نظر سے تاکتے ہوئے بولی "کس کو دے آئے ہو؟"

"ارے کس کو دیتا، اور کون لیتا ہے ہات ــ اور وہ بھی بایاں!"

"تم نے ضرور کسی کے ہات میں ہات دیا ہوگا۔ اور وہ رنگین چڑیا، آفت کی پڑیا اسے لے کے چل دی ہوگی۔ یا تم نے کسی کی کمر میں ہات ڈالا ہوگا اور نکالنا بھول گئے ہوگے!"

"میڈم یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ دیکھتی نہیں ہو میرا بایاں ہات غائب ہے۔!"

"تو میں کیا کروں؟" وہ ایک جمائی لے کر بولی "ڈھونڈو، کہیں اِدھر اُدھر رکھ کے بھول گئے ہوگے، تمہاری پرانی عادت ہے، چیزیں اِدھر اُدھر رکھ کے بھول جاتے ہو۔"

سارا گھر چھان مارا، پتلون کی دونوں جیبیں دیکھ ڈالیں، غسل خانے کا لوٹا تک دیکھ ڈالا۔ نوکر کو ڈانٹ ڈپٹ کر پوچھا۔

"تو نے میرا بایاں ہات تو نہیں لیا؟ سچ سچ بتا، نہیں تو ابھی ایک ہاتھ دوں گا۔!"

وہ بے چارہ گھبرا کر بولا "حضور، میں آپ کا ہات لے کر کیا کروں گا۔ میرے دونوں ہات پہلے سے موجود ہیں، دیکھ لیجئے۔!"

واقعی بات تو ٹھیک ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ موجود تھے۔ پھر وہ تیسرا ہات لے کر کیا کرتا اور جسم کے کس حصے پر لگاتا! میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اور سڑک پر ہو لیا۔ جہاں میں رات کا کھانا کھانے کے بعد سیر کے لئے جاتا ہوں۔

میری پرانی عادت ہے کہ چلتے وقت دونوں ہات جھلا کر چلتا ہوں، ممکن ہے رات کو سیر کرتے وقت بایاں ہات ذرا زور سے جھلا دیا ہو اور وہ بے چارہ میرے سے ٹلنے سے کھسک کر کسی گڑھے میں گر پڑا ہو!

سڑک کے کنارے سارے گڑھے دیکھ لئے۔ ہات کہیں نہیں ملا۔ بنیئے کی دوکان پر گیا جو نکڑ پر واقع تھی اور جہاں سے میں نے رات کو گھر جاتے ہوئے رُک کر کچھ ضروری سودا سلف خریدا تھا!

بنیا میری بات سن کر دونوں ہات جوڑ کر بولا "ناں بابا جی، ہم کسی کا پرایا ہات نہیں رکھتے۔ رام رام۔ ایسا بُرا کام ہم کبھی نہیں کرتے!"

"اسے مٹھو مل، تمہاری تو پرانی عادت ہے۔ رام رام جپنا اور پرایا مال اپنا، نکال میرا بایاں ہات......!"

"نہیں بابو جی، ہم نے آپ کا بایاں ہاتھ نہیں دیکھا۔ ہماری دوکان پر اگر کوئی گاہک اپنی چیز بھول جاوے تو ہم اسے سنبھال کر رکھیں ہیں ایک دفعہ ایک گاہک برسات کے زمانے میں اپنی چھتری بھول گیا تھا۔ اگلی برسات کو ہم نے اس کی چھتری واپس کر دی۔ اب چھتری تو بھلا کام کی چیز ہے۔ آپ کا بایاں ہات کس کام کا ــ؟"

تھک ہار کر میں پولیس میں جانے والا تھا۔ پھر بنیئے کی بات یاد آگئی۔ واقعی بایاں ہات کس کام کا.... ؟ سارا کام تو میں دائیں ہات سے کرتا ہوں۔ لکھتا دائیں ہات سے ہوں۔ لڑتا دائیں ہات سے ہوں۔ اور آداب کرتا دائیں ہات سے ہوں ایک ہات جوڑنے کے وقت دونوں ہات کام آتے ہیں چلو اچھا ہوا، بائیں ہات کے غائب ہونے سے بار بار ہات جوڑنے کی خوشامدانہ عادت چھوٹ جائے گی۔ بائیں ہات کا کون سا ایسا کام ہے جو میں دائیں ہات سے نہیں کر سکتا؟ پھر پولیس میں رپٹ ہو گی تو طرح طرح کے سوال پوچھے جائیں گے۔ تمہارا نام کیا ہے، باپ کا نام کیا ہے۔ دادا کا نام کیا تھا؟ کس وقت چوری ہوئی؟ کہاں پر چوری ہوئی؟ تمہارے پاس اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارا کبھی بایاں ہات بھی تھا؟ اگر رات کو سوتے وقت

تمہارا بایاں ہات گم ہوا تو بیوی کی شہادت درکار ہے۔ اُسے تھانے میں پیش کرو. ممکن ہے تمہاری بیوی نے تمہارا ہات چرا کر اپنے بینک لاکر میں بند کر دیا ہو؟ ورنہ بیوی کی نیک چلنی کی ضمانت پیش کرو. ممکن ہے تم نے خود ہی اپنا ہات غائب کر دیا ہو۔ آج کل ایسے قصّے بہت سننے میں آتے ہیں کہ خود ہی چیز غائب کر دی اور چوری کا الزام دوسرے پر تھوپ دیا۔ ممکن ہے اس بائیں ہات سے تم نے کوئی لمبا ہات مارا ہو، اور اب پکڑے جانے کے ڈر سے خود ہی غائب کر دیا ہو. کس رنگ کا ہات ہے؟ کتنا لمبا ہات ہے؟ کتنی انگلیاں تھیں؟ اگر پانچ تھیں تو کیا پانچوں کی پانچوں گھی میں تھیں؟ اور اگر پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں تو سر کہاں پر تھا؟ تفصیل سے بیان کرو.....!

غرضیکہ میں نے پولیس میں رپورٹ کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ چند دنوں تک سڑک پر ہر آتے جاتے کو بڑے غور سے دیکھتا رہا کہ کہیں کوئی تین ہات والا آدمی ملے تو اسے فوراً پکڑ کر دبوچ لوں، مگر شومئی قسمت سے کوئی تین ہات والا آدمی نہ ملا۔ ایسے تو کئی ملے، جن کا ایک ہات میری طرح غائب ہو چکا تھا۔ آخر کار ایک ہی ہات پر صبر کر لیا۔ کچھ دنوں بعد دوسرے ہات کی کمی کا احساس بھی جاتا رہا۔ کیونکہ بایاں ہات تھا، جو اکثر مجھے بیکار اور فاضل عضو معلوم ہوا۔ کبھی کبھی تو اس سے حد درجہ رقابت محسوس ہوئی۔ مثلاً آپ اپنی محبوبہ کی کمر میں اپنا دایاں ہات ڈالے چل رہے ہیں تو آپ کے ساتھ ساتھ آپ کا بایاں ہات بالکل ایک تیسرے اور اجنبی آدمی کی طرح چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جس سے آپ پیچھا بھی نہیں چھڑا سکتے۔ اچھا ہوا کمبخت خود ہی کہیں غائب ہو گیا۔ چند ماہ کے بعد میں یہ تک بھول گیا کہ میرا کبھی کوئی دوسرا ہات بھی تھا۔

پھر ایک دن میرا ایک کان غائب ہو گیا اس دن بھی سو کے اُٹھا ہی تھا، اور منہ پر ہات پھیر رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرا ایک کان غائب ہے۔ دو تین بار چہرے پر ہات پھیر کے دیکھا کہ میرا دایاں کان غائب تھا اور جہاں اُسے ہونا چاہیئے وہاں جلد بالکل صاف اور سپاٹ تھی۔

جیسے کبھی یہاں کوئی کان تھا ہی نہیں۔ جلدی سے بستر سے اُٹھ کے آئینے کے سامنے گیا، واقعی میرا دایاں کان غائب تھا۔

چند لمحے عجیب سکتے اور حیرت کے عالم میں گزرے۔ کہاں گیا میرا کان؟ تکیے اُٹھا کے دیکھا کھاٹ کو اُٹھا کے جھاڑا۔ شور سُن کر بیوی جاگ گئی ــ "سونے نہیں دو گے، اب کیا افتاد آپڑی؟" وہ آنکھیں بند کئے غنودگی بھرے لہجے میں بولی۔

"میرا دایاں کان غائب ہے!"

"ارے کہاں غائب ہے۔ تمہارے تو شیطان کے سے کان ہیں، یہ کیسے غائب ہو سکتے ہیں بھلا!"

"نہیں غور سے دیکھو، نیک بخت۔ واقعی ایک کان غائب ہے!"

"ارے تم تو سُنی اَن سُنی کر دیتے ہو، ایک کان سے سنتے ہو، دوسرے سے اُڑا دیتے ہو، میں تمہیں کیا جانتی نہیں ہوں۔ کان غائب ہے۔ تمہارے کان تو ہر وقت غائب رہتے ہیں!"

"آنکھیں کھول کے دیکھو پیاری، واقعی میرا دایاں کان غائب ہے!"

اب کے وہ بہت چکرائی، سینے پر دو ہتھڑ مار کر بولی "یہ کیا ہو رہا ہے ہولے ہولے تم اپنی ساری چیزیں گم کر رہے ہو۔ پہلے ہات گیا، اب کان گیا۔ کل کو ٹانگ جائے گی، پرسوں دھڑ، میں تو سمجھتی ہوں۔ تم ہولے ہولے جان بوجھ کر اپنے آپ کو MAKE یاد کر رہے ہو۔ ایک دن تم گھر سے غائب ہو جاؤ گے اور کسی دوسری ہوتی سوتی کا گھر آباد کر دو گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی! میں تمہارے سب چلتر جانتی ہوں!"

اس دفعہ سب یاروں دوستوں نے صلاح دی ہے کہ مجھے ضرور پولیس میں جانا چاہیئے اور اس عجیب و غریب چوری کی واردات کی رپورٹ لکھوانی چاہیئے۔ بہت غور و خوض کے بعد میں

میں نے پولیس میں رپورٹ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ آخر کوئی اتنا بڑا نقصان تو نہیں ہوا میرا۔ ایک کان چلا گیا تو کیا ہوا۔ دوسرا تو موجود ہے۔ کام کی بات تو اس سے بھی سنی جا سکتی ہے اور بے کار باتیں سننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے اور اب ایک کان بھی نہیں ہے تو اب بیوی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ تم اس کان سے سُن کر اس کان سے اُڑا دیتے ہو۔ کیونکہ دوسرا کان موجود نہ ہونے کی صورت میں وہ ایسی شکایت نہیں کر سکتی۔ پھر صرف ایک کان ہونے پر دنیا کا شور بھی آدھا ہو جائے گا۔ اور پھر اس صنعت زدہ مشینی زندگی میں شور اس قدر ہے کہ اس شور سے زندگی آدھی ہو جاتی ہے لہٰذا ایک کان ہونے سے میری زندگی بڑھ جانے کی صلاحیت بڑھ سکتی ہے چنانچہ اس امر پر جتنا زیادہ غور کیا، ایک کان کو اپنے لئے دو کانوں سے زیادہ مفید پایا۔ لہٰذا پولیس میں جانے کا خیال ترک کیا۔!

چند ماہ بڑے سکون اور اطمینان سے گزرے۔ پھر ایک دن میری ایک آنکھ غائب ہو گئی۔ ہوا یہ کہ میں اپنے مطالعے کے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کتاب بے حد دلچسپ تھی اور موضوع دقیق، لہٰذا چند صفحے پڑھنے کے بعد میں کرسی پر بیٹھا بیٹھا سو گیا۔ جب جاگا تو معلوم ہوا کہ سہ پہر ڈھل چکی ہے اور شام آ چلی ہے۔ میں نے اُٹھ کر جلدی سے کمرے میں روشنی کی۔ غسل خانے میں گھس کر ہاتھ منہ دھویا۔ منہ ہات دھوتے دھوتے یکایک میری اُنگلیوں نے محسوس کیا کہ میرے چہرے سے میری ایک آنکھ غائب ہے۔ گھبرا کر اور سر اُٹھا کر میں نے سامنے کی دیوار گیر آئینے میں دیکھا۔ واقعی بائیں ابرو کے نیچے جہاں آنکھ کو ہونا چاہیئے تھا۔ وہاں سے آنکھ غائب تھی۔ وہاں نہ پپوٹے رہے نہ پلکیں، نہ پتلی، صاف شفاف جلد تھی اور کچھ نہیں۔ بار بار آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، دوسری آنکھ نظر نہ آئی، جیسے کبھی تھی ہی نہیں چہرے پر۔۔۔!

"یہ کیا ہوا؟" دماغ چند لمحوں کے لئے بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا۔ جب ہوش میں آیا تو میں نے زور کی ایک چیخ ماری!

میری چیخ سن کر میری بیوی دوڑی دوڑی غسل خانے میں گھس آئی۔ بولی "کیا ہوا؟ آنکھ میں صابن پڑ گیا؟!"

"نہیں میری ایک آنکھ غائب ہے!"

"کون سی؟"

"بائیں!"

ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ بولی ــــ "ضرور تم نے کسی پر بُری نظر ڈالی ہو گی!"

"ڈارلنگ"

"یا کسی حرافہ سے آنکھیں چار کی ہوں گی.... !"

"اُف ـــــ!"

"یا کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا ہو گا۔ کہیں آنکھ طائی ہو گی اور وہ چھنال اُچک کے لے گئی ہو گی!"

میں نے بیوی سے مزید پوچھ تانچھ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ اس کی تو ایک ہی رٹ ہے اس لئے میں نے اپنی کتاب کا ایک ایک ورق چھان مارا۔ کرسی کے نیچے دیکھ لیا۔ عینک کے چرمی خول کو ٹٹول ٹٹول کے دیکھ لیا۔ کئی دن تک دوسرے دوستوں کے گھر دں میں اپنی آنکھ ڈھونڈتا رہا۔ مگر آنکھ کہیں نہ ملی۔ اگر کسی نے چرائی بھی ہو گی تو کوئی واپس دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ میں بزنس مین ہوں میں سمجھ سکتا ہوں۔ آج کل لوگوں کی آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔ مروت نام کی کوئی شئے نہیں رہی۔ مثل مشہور ہے۔ مارے گھٹنا۔ پھوٹے آنکھ....

مگر میں نے تو کہیں گھٹنا بھی نہیں مارا ۔۔۔۔ پھر آنکھ کدھر غائب ہو گئی ؟

اس دفعہ تو بیوی نے بھی پولیس میں جانے کی صلاح دی ۔ مگر عقل نے اس کے خلاف رائے دی ۔ دیکھیئے ایک تو میں مصروف بزنس مین ہوں کام دھندا اتنا پھیلا رکھا ہے کہ اس چھوٹی سی چیز کی گمشدگی کی رپورٹ کرنے پر میرا جو وقت صرف ہو گا وہ میں کسی بہتر دھندا میں صرف کر سکتا ہوں ٹھیک ہے ایک آنکھ گئی مگر دوسری موجود ہے اور ایک آنکھ کے جانے سے دوسری آنکھ کی بینائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ دونوں آنکھ کے برابر معلوم ہوتی ہے اسے فطرت میں LAW OF COMPENSATION کہتے ہیں ۔ پھر ایک آنکھ رکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ اب ساری دنیا کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہوں ۔ یعنی تقریباً تقریباً سوشلسٹ محسوس کرتا ہوں ایک آنکھ کے چلے جانے سے میری صورت ضرور بگڑ گئی تھی ، چند دنوں کے لئے ۔ مگر اب تو میرے ماہر چشم ساز اور عینک ساز ڈاکٹر سوزانی نے ایسی نقلی آنکھ لگا دی ہے کہ جی چاہتا ہے ۔ کہ اپنی اصل آنکھ بھی نکال کر اس کی جگہ دوسری نقلی آنکھ لگوالی جائے ۔ غرضیکہ جس نہج سے دیکھیئے مجھے ایک آنکھ سے فائدہ ہی نظر آتا ہے ۔

پرسوں میرا بٹوہ چوری ہو گیا ۔ تکیے کے نیچے پڑا تھا ۔ بٹوے میں دس روپے تھے ۔ کیونکہ اس سے زیادہ رقم میں بٹوے میں نہیں رکھتا ہوں ۔ رات کو سیف میں رکھتا ہوں ۔ مگر دس روپے ضرور تھے اور دس روپے آخر دس روپے ہوتے ہیں !

میں نے اس چوری کا بیوی سے ذکر کیا تو اس نے کانوں پر ہاتھ دھرے ۔ جھاڑو بہارو کرنے والی نوکرانی سے پوچھا ۔ تو وہ چیخنے چلانے لگی اور اپنی بے گناہی کی قسمیں کھانے لگی ۔ بالآخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ نوٹ باورچی کے تکیے کے نیچے سے مل گیا جو چار روز سے بخار میں پڑا تھا ۔ میرے ڈرانے دھمکانے پر اس نے اقبالِ جرم کر لیا کہ دس کا نوٹ اس نے چرایا تھا ۔

میں نے اسے زور کے دو دھپ مارے اور کان پکڑ کر اٹھا دیا "حرامزادے ہمارا نوکر ہو کر ہمارے ہی گھر میں چوری کرتا ہے!"

"جانے دو، جانے دو" میری بیوی اس پر ترس کھا کر بولی "دیکھتے نہیں ہو، چار روز سے بخار میں پڑا ہے۔ انجکشن کے لئے پیسے مانگ رہا تھا میں نے نہیں دیئے۔ میں بھول گئی"

"تم بھول گئیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ چوری کرے!" میں نے باورچی کے ایک زور کی ٹھوکر ماری۔ وہ دھڑام سے فرش پر گرا اور کراہنے لگا۔!

"جانے دو۔ جانے دو" میری بیوی ہات جوڑ کر بولی "دیکھتے نہیں ہو، بیچارا غریب چار روز سے بخار میں پھنک رہا ہے دس روپے تمہارے لے گئے تو تمہارا کون سا ایسا نقصان ہو گیا۔ تم لاکھوں کماتے ہو!"

"دس روپے!" میں نے گرج کر کہا "دس روپے کی تم قدر و قیمت کیا جانو، کتنی بے ایمان محنت، کیسی غلیظ ضمیر فروشی سے میں یہ دس روپے کماتا ہوں۔ تم ان دس روپے کی اہمیت کیا جانو۔ یہ میں جانتا ہوں!" "اب درگزر کرو!" "نہیں۔ اس نے میرے دس روپے غائب کئے ہیں۔ میں اس چور کو اس چوری کی قرار واقعی سزا دلواؤں گا" یہ کہہ کر میں نے باورچی کو گردن سے پکڑا اور لے چلا اسے پولیس میں رپورٹ کرنے....!

جگر گوشے

دس سال سے یعنی جس دن سے میری شادی ہوئی ہے۔ یہی ایک سوال بار بار کسی نہ کسی صورت میں ہمارے سامنے دہرایا جاتا ہے۔ آپ کے ہاں بچہ کیوں نہیں ہوتا؟ — یہ کوئی نہیں پوچھتا۔ آپ کے ہاں روٹی ہے؟ گھر ہے؟ روزگار ہے؟ خوشی ہے؟ عقل ہے؟ سب یہی پوچھتے ہیں۔ آپ کے ہاں بچہ ہے؟ گویا بچہ ان تمام ضروریاتِ زندگی کا نعم البدل مان لیا گیا ہے۔ ہم دونوں کو اس سوال سے انتہائی کوفت ہوتی ہے۔ مگر کیا کریں سماجی سکون کی خاطر طرح طرح سے اس سوال کو ٹالنا پڑتا ہے۔ میرے ایک دوست ہیں ماشاءاللہ سات عدد بچوں کے باپ ہیں۔ اور آٹھویں کی فکر میں ہیں۔ اُن کے بچے اکثر بیمار رہتے ہیں۔ آج ایک کو کالی کھانسی ہے تو دوسرے کو بخار ہے۔ تیسرے کو چیچک نکل آئی ہے تو چوتھے نے سڑک پر گرا کر اپنا سر پھوڑ لیا ہے۔ پانچویں کی آنکھیں دُکھتی ہیں تو چھٹا صرف

اس بات پر اُدھار کھائے ہوئے ہے۔ کہ کب کسی مہمان کی گود میں بیٹھے اور پیشاب کرے۔ مگر اس روشن ضمیر اولاد کے والد کو ایک ہی غم کھائے جا رہا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے مجھ سے سوال کرتے رہتے ہیں" آپ کے ہاں بچہ کیوں نہیں ہوتا۔؟"

میں اس سوال کے جواب میں اکثر اپنی ڈبڈبائی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا کر نہایت مسکین لہجے میں جواب دیتا ہوں "کیا بتاؤں، نہیں ہوتا ——!" گویا اس حادثہ یا عدم حادثہ کی ذمے داری مجھ پر نہیں خدا پر عاید ہوتی ہے۔ مگر میرے دوست کی تسلی اس جواب سے نہیں ہوتی۔ آگے جُھک کر بڑے رازدار لہجے میں فرماتے ہیں:۔

"کسی ڈاکٹر کی مدد لیجئے۔"

میں کہتا ہوں" کیسے لے سکتا ہوں۔ جس ڈاکٹر کے ہاں ہم لوگوں کا علاج ہوتا ہے اس کے ہاں خود کوئی بچہ نہیں ہے"

وہ فوراً گھبرا کر کہتے ہیں" آپ سمجھے نہیں۔ میرا مطلب ہے کسی ڈاکٹر کو دکھایئے۔ ممکن ہے آپ کے اندر کوئی نقص ....."

میں بات کاٹ کر کہتا ہوں" دکھایا ہے کوئی نقص نہیں ہے"

"اور ہماری بھابھی۔؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں ——"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ آپ بھی ٹھیک ہیں" میرے دوست حیرت سے کہتے ہیں۔

"پھر بھی بچہ نہیں ہوتا، حیرت ہے صاحب!"

یہ کہہ کر غور سے اور انتہائی شُبے سے مجھے دیکھنے لگتے ہیں۔ جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اور کسی خوفناک بلکہ شرمناک مرض کا شکار ہوں۔ اور اُن سے دانستہ چھپا رہا ہوں۔ ان کا بس

نہیں چلتا۔ ورنہ وہ خود کھڑے کھڑے ہم دونوں کا ڈاکٹری معائنہ کر لیں۔

ایک اور دوست ہیں ہمارے! اُنہیں یہ تو شبہ نہیں ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی میں خدانخواستہ کوئی نقص ہے۔ مگر وہ یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ دیدہ دانستہ بچّہ پیدا نہیں کرتے۔ وہ جب بھی ہمارے ہاں آتے ہیں۔ بچّوں کے فوائد پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ البتہ تقریر کرتے وقت انداز سیاستدان کا سا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ایسے بروکر کا ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں بچّہ ہونے پر فوراً کمیشن ملے گا۔ ! میں اُن سے بہت اُلجھتا ہوں۔ کیونکہ خواہ مخواہ شبہ ہو جاتا ہے۔ کہ بچّہ مَیں پیدا کروں گا۔ لیکن فائدہ ان کو ہو گا۔ جی یہی چاہتا ہے کہ محض ان کو زک دینے کے لئے زندگی بھر کوئی بچّہ پیدا نہ کیا جائے۔ اکثر فرماتے رہتے ہیں۔ اگر آپ کے گھر کوئی بچّہ ہوتا تو میں ضرور اُس کی شادی اپنی مُنّی سے کرتا۔ اب ان کی مُنّی انتہائی بدصورت بھینگی۔ بدمزاج اور مرگھلی ہے۔ محلے کے سب بچّوں سے لڑتی رہتی ہے۔ اس کے سر پر بال اس قدر کم ہیں کہ بڑی ہونے پر انشاء اللہ واقعی گنجی ثابت ہو گی۔ مگر یہ حضرت ہیں کہ میرے گھر میں اسی چاند سی بہو کا اضافہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس مُنّی کو دیکھ کر مجھے نہ صرف اپنے بچّے بلکہ ان تمام بچّوں کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے۔ جو ابھی پیدا نہیں ہوئے یا جن کے پیدا ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔

ہمارے ایک تایا ہیں۔ پچاسی برس کی عمر ہونے پر بھی اُن کا نام چھُٹن لال ہی ہے۔ تایا چھُٹن لال بچّوں کے بے حد قائل ہیں اور جوں جوں بوڑھے ہوتے جاتے ہیں۔ بچّوں کے زیادہ سے زیادہ قائل ہوتے جاتے ہیں۔ گھر آتے ہی میرے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہیں۔ (مجھ پر کم۔ میری بیوی پر زیادہ) پھر ایک آہ سرد بھر کر کہتے ہیں۔

"افسوس تمہارے ہاں کوئی بچّہ نہ ہوا۔ اُسے گود میں کھلانے کا ارمان دل ہی دل

میں رہ گیا۔"

میں جواب دیتا ہوں" مجھے ہی گود میں کھلا لیجئے۔"

تو اس پر برہم ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔"

"تو نہیں جانتا۔ تو تو احمق ہے۔ نرا پورا احمق! بچے تو گھر کی رونق ہوتے ہیں۔ وہ کبھی جھگڑتے ہیں۔ کبھی ہنستے ہیں۔ کبھی روتے ہیں۔ کبھی چلاتے ہیں۔ دھول دھپا کرتے ہیں۔ بچوں کے ہونے سے گھر میں عجیب سی رونق رہتی ہے۔"

میں کہتا ہوں" اس کام کے لئے ہمسائے کے بچے کیا کافی نہیں ہوتے؟ پھر جہاں تک چیخنے چلانے کا تعلق ہے۔ آدمی بچے کیوں پیدا کرے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کا کوئی ڈرامہ کیوں نہ سن لے۔ جس میں چیخنے چلانے کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اس کے لئے ایک بچے کو نو مہینے پیٹ میں رکھنا۔ پھر اُسے پالنا پوسنا اور اُس پر ہزاروں روپے خرچ کرنا کیا ضروری ہے۔ جب کہ یہ کام بآسانی ریڈیو کی ایک سوئی گھمانے سے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔"

میری یہ بات سُن کر وہ اور برہم ہو جاتے ہیں۔

"تیری تو مت ماری گئی ہے۔ اور تو اپنے ساتھ اپنی بیوی کو بھی لے ڈوبے گا" پھر وہ بڑے پیار سے میری بیوی کی طرف مخاطب ہو کر کہتے ہیں — "کیوں بٹیا! تجھے تو بچے پسند ہیں نا۔؟"

اور میری بیوی لجا کر نہایت شرمیلی آواز میں جواب دیتی ہے" جی ہاں! بشرطیکہ وہ دوسروں کے ہوں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہوں۔ اور غسلخانے سے فارغ ہو چکے ہوں!"

اس پر تایا جی ہنس پڑتے ہیں۔ اور میری بیوی کے ہات سے دودھ جلیبی کھا کر

رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ دعا دیتے ہوئے "بھگوان تیری کوکھ ہری کرے"

اب یہ کون کس کو سمجھائے کہ جوں جوں کوکھ ہری ہوتی جاتی ہے یہ دنیا اُجڑتی جاتی ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی آبادی دس کروڑ تھی۔ اب چالیس کروڑ ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں آٹا روپے کا ڈیڑھ من تھا۔ اب روپے کا ڈیڑھ سیر بھی مشکل سے ملتا ہے۔ سائنسدانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر دنیا کی کوکھ اسی طرح ہری ہوتی رہی تو اگلے تین سو سال کے بعد انسانی آبادی اس قدر بڑھ جائے گی کہ ایک انسان کے حصّے میں صرف ایک مربع گز زمین آئے گی۔ اب اس ایک گز زمین میں آپ چاہے کھڑے ہولیں چاہے بیٹھ لیں چاہے سولیں یا چہل قدمی کریں۔ ایک مربع گز زمین پر آپ اپنا اس پر گھر بنا لیجئے۔ اُسی پر اپنی قبر! اس سے زیادہ زمین آپ کو تین سو سال کے بعد نہیں ملنے والی ہے۔ اور سائنسدانوں نے یہ بھی اندازہ لگایا ہے کہ جس رفتار سے بچّے آج کل پیدا ہو رہے ہیں۔ اس شرح کیمطابق اگلے سات سو سال میں انسانوں کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ ان کا کل وزن مِلا کے زمین کے وزن سے بڑھ جائے گا۔

لازماً زمین اتنا بوجھ نہیں سہار سکے گی۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ یعنی قیامت آ جائے گی۔ گویا جو بچے پیدا کرتا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے قیامت کو قریب لاتا ہے۔ مگر ہندوستان میں یہ بات آپ کسی سے نہیں کہہ سکتے۔ کسی کی کوکھ ہری ہو نہ ہو آپ کی چُندیا ضرور ہری کر دی جائے گی۔

اس لئے بچوں کے سلسلے میں مجھے تو آج تک اپنا ہم خیال نہیں مِلا۔ لیکن ایک بار میری بیوی کو ایک ایسی سہیلی مل گئی تھی۔ قصہ یہ ہوا کہ ایک روز میری بیوی اکیلے سینما دیکھنے چلی گئی۔ کوئی ہندوستانی پکچر تھی۔ اُس تصویر میں ٹُن ٹُن کے بارہ بچے۔ پُورے بارہ بچّے تلے

اُوپر کے دکھائے گئے تھے۔ بارہ بچّوں کی لین ڈوری کو دیکھ کر میری بیوی تو ہنسی ہی لیکن ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ایک عورت بھی ہنس پڑی۔ میری بیوی کو دیکھ کر پہلے تو بڑی حیرت ہوئی۔ بعد میں اُس نے اس عورت سے بہناپا کر لیا۔ بہت بعد میں میری بیوی کو پتہ چلا کہ وہ عورت محض اس لئے ہنسی تھی کہ اُس کے صرف گیارہ بچّے تھے! ظاہر ہے گیارہ بچّوں والی عورت کو بارہ بچّوں والی عورت پر ہنسنے کا پورا پورا حق ہے۔

یہ اکثر کہا گیا ہے کہ بچّے قوم کی دولت ہوتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ہندوستان کا شمار دنیا کی امیر ترین قوموں میں کرنا چاہیئے زندگی کے کسی اور شعبے میں ہم دولت پیدا کریں یا نہ کریں۔ بچّے پیدا کرنے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں۔ ہمارے محلے میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ نام ان کا دولت رام ہے اور واقعی بچّوں کی دولت کے اعتبار سے وہ ہمارے محلے کے رئیس سمجھے جا سکتے ہیں۔ اب تک دس بچّے تصنیف فرما چکے ہیں۔ جب ان کے ہاں پہلا بچّہ ہوا تو ان کے گھر میں موٹر گاڑی تھی۔ ریفریجیریٹر تھا۔ ریڈیوگرام تھا۔ غالیچہ تھا۔ صوفہ تھا۔ بجلی کا پنکھا تھا غرضیکہ آرام و آسائش کی ہر چیز مہیا تھی۔ پھر جب دوسرا بچّہ پیدا ہوا تو موٹر گئی۔ تیسرے بچّے کے تولد ہونے پر ریڈیوگرام گیا۔ چوتھے پر ریفریجیریٹر۔ پانچویں پہ غالیچہ۔ چھٹے پر صوفہ۔ ساتویں پر پنکھا۔ اب دسویں بچّے کی پیدائش پر چند ہفتے ہوئے اُن کے گھر کی بجلی بھی کٹ گئی ہے۔ یعنی جس منزل اور قیام پر کل ہندوستان اورنگ زیب کے زمانے سے اب تک ڈیڑھ سو سال میں پہنچا ہے وہ انہوں نے دس سال میں حاصل کر لیا ہے اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں نظر آتے ہیں۔ اکثر ایک بچّے کو کندھے پر چڑھائے۔ دوسرے کو گود میں اٹھائے۔ تیسرے کو اُنگلی سے لگائے میرے پاس آتے ہیں اور چوتھے بچّے کو میری گود میں دے کر کہتے ہیں "بھائی صاحب! اب آپ بھی بال بچّوں والے ہوتے تو اپنے بچّے کو گود میں لے کر کیسے خوش

ہوتے !"

اور میں جلدی سے اُن کے بچّے کو گود سے اُتار کر کہتا ہوں :۔

"بہنے دیجئے بھائی صاحب ! میں لنڈورا ہی بھلا " اس پر اُن کا بچّہ میری گود سے اُترنے سے انکار کر دیتا ہے اور اپنی ناک سے اُنگلی نکال کر میرے منہ میں ٹھونستے ہوئے کہتا ہے۔

"آہا۔ میرا چاچا لنڈورلا۔ میرا چاچا لنڈورلا ۔۔۔۔"

ملاحظہ فرمایئے اِن بچّوں کے نام کس قدر عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ جو لڑکا ہے۔ وہ گُڈّو ہے یا بجّو ہے ۔ یا پگّو ہے یا ستّو ہے یا جھنّو ہے ۔ وہ راکی ہے ۔ کراکی ہے ۔ راقی ہے ۔ پاقی ہے ۔ چپپڑ قناقی ہے ۔ جو لڑکی ہے وہ گیگلی ہے ۔ گوگلی ہے ۔ شنّی ہے ۔ ڈنّی ہے ۔ چمّی ہے ۔ پمّی ہے ۔ الّی ہے ۔ بلّی ہے ۔ مرگھلّی ہے ۔ آج تک آپ نے کسی بچّے کا نام قاعدے اور ڈھنگ کا نہیں سُنا ہوگا ۔ اس بات سے جہاں والدین کے ذہن کی غُربت پر روشنی پڑتی ہے ۔ وہاں اُن بچّوں کے مستقبل کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے ۔ جو یہ نام لے کر زندگی کے سفر پر نکلتے ہیں۔ اس حساب سے اپنے بچپن میں پنڈت جواہر لال نہرو کا نام ضرور جوّو رہا ہوگا ۔ میک ملن کا مکّی اور کینیڈی اگر ہندوستان میں پیدا ہوتے تو ضرور اُن کا نام کِڈا ہوتا ! ___ میرے خیال میں بڑے آدمیوں کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بچپن کے مضحکہ خیز ناموں کے باوجود بڑے آدمی بن جاتے ہیں ۔ اور جو عام صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں ۔ جیسے کہ اکثر لوگ ہوتے ہیں ۔ وہ اسی مضحکہ خیزی کی بدولت ایک مضحک انجام کو پہنچ جاتے ہیں ۔

بات اگر ناموں تک ہی محدود ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اچھے بھلے لوگ ۔ ایسے لوگ بھی جن کی انشا پردازی ادبیت ، صحافت اور خطابت کی ساری دُنیا میں دھوم ہے ۔ اپنے بچّوں سے اکثر اسی لہجے میں مخاطب ہوتے ہیں : " تو مُیرا ڈڈّو ہے

پپلو ہے پچپا گھپلو ہے۔ میرا منّا تو آکا باکا ہے۔ گجّو پاکا ہے۔ چن پٹا کا ہے۔ اے تو ہپا کھائے گا؟ تپا کھائے گا؟ دھپا کھلے گا؟ ایں؟ ۔۔ یہ کیا زبان ہے؟ یہ نہ اردو ہے نہ ہندی۔ گجراتی ہے نہ مراٹھی۔ پشتو نہ بلوچی۔ انگریزی ہے نہ لاطینی۔ یہ تو سپرانٹو تک نہیں۔ خدا جانے کس دیس یا قوم کا فرد اپنے بچے سے اس زبان میں گفتگو کرے گا۔ اور بچے بھی ایسے نامعقول ہوتے ہیں۔ کہ غوں غاں کرتے ہوئے بائیں اُچھال کر ٹانگیں اُٹھا کر منہ پر جھاگ کے بُلبلے چھوڑتے ہوئے ہنس ہنس کر سر ہلاتے ہوئے اسی زبان میں جواب تصنیف فرمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالباً دُنیا کی یہی ایک واحد زبان ایسی ہے جس کے لیے ڈکشنری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ڈکشنری کیا اس کے لیے کسی کتاب، کسی گرامر، کسی قاعدے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہی زبان سیکھ کر جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور زندگی کے مسائل سے اُلجھ کر اپنا مافی الضمیر بھی ٹھیک طرح سے بیان نہیں کر سکتے تو اس میں حیرت کی بات کیا ہے؟ یہی بچے جب بڑے ہو کر کتابوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اور بار بار سینما دیکھنے پر اصرار کرتے ہیں تو انہیں قابلِ ملامت کیوں سمجھا جائے۔ سارا قصور اُن کے والدین کا ہے۔ جو اُن کی تربیت ہی اسی انداز سے کرتے ہیں۔

تربیت سے یاد آیا کہ بالعموم بچوں کی تربیت ایک سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ آج کل یہ ایک طرح کا فیشن چل نکلا ہے کہ بچوں کو روکو نہ ٹوکو۔ جو اُن کا جی چاہے وہی کرنے دو۔ سُنا ہے اس سے بچوں کی بہت سی نفسیاتی الجھنیں دُور ہو جاتی ہیں۔ یعنی وہ الجھنیں جو بڑے ہونے پر اُن کو لاحق ہو سکتی تھیں۔ یہ بھی سُنا ہے کہ ایسی نفسیاتی ایجاد کا سہرا فرائیڈ کے سر ہے۔ جس سے بڑا الجھنوں کا بانی اور گورکھ دھندے باز اس دُنیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔

میرے عزیز دوست دولت رام فرائیڈ کے اس مقولے پر بڑی پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ بلکہ بچوں کو بے راہروی پر اُکساتے ہیں۔ یعنی فرائیڈ سے بھی دو ہاتھ آگے جاتے ہیں۔

یک دفعہ کا ذکر ہے۔ یہ حضرت مع اپنی بیوی کے اور چھ بچوں کے ہمارے گھر میں اس وقت وارد ہوئے جب ہم میاں بیوی نہا دھو کر اُجلے کپڑے پہن کر سینما جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمارے ہندوستانی سماج کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ آپ کتنے ہی ضروری کام یا ضروری تفریح کے لئے جا رہے ہوں گھر میں اگر مہمان آجائے تو آپ کہیں نہیں جا سکتے۔ مہمان سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ کو لا محالہ رُکنا پڑے گا، رُک کر گھنٹوں بات کرنا پڑے گی اور باتوں کے دوران میں بات بے بات بلا وجہ یوُں ہنسنا پڑے گا۔ الغرض یوں ظاہر کرنا پڑے گا کہ آپ اپنے ہمسائے کی آمد سے بے حد خوش ہوئے ہیں۔ حالانکہ اندر ہی اندر آپ کا دل اُنہیں قتل کرنے کو چاہتا ہو گا۔ مگر تہذیب مانع ہے۔ آپ مُسکرا کر اور خون کا گھونٹ پی کر (ہمسائے کا نہیں، اپنا) خیر مقدم کرنے پر مجبور ہیں۔

مگر ہمسائے کے لئے تو کسی خیر مقدم کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کو ہو تو ہو۔ ہمسائے کو نہیں ہوتی۔ چنانچہ دولت رام نے آتے ہی میری پیٹھ پر ایک زور کا دھپ دیا۔ اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بڑی بے تکلفی سے میری ہڈّی پسلی ایک کرتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے مسز دولت رام نے میری بیوی سے باتیں شروع کر دیں اور بچوّں نے غالیچے پر کھڑے ہو کر چاروں طرف کمرے کے سامان کا یوُں جائزہ لینا شروع کر دیا۔ جیسے وہ کسی کمرے میں نہیں کسی جنگل میں آنکلے ہوں۔ اُس کے بعد دو بچوّں نے ٹارزن کی طرح ایک خوفناک چیخ اپنے حلق سے نکالی اور ریڈیو گرام کی طرف لپکے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مگر بچوّں کو کسی کے دل کے دورے سے کیا غرض۔ چنانچہ ایک بچے نے بڑھ کے ریکارڈ بجانے شروع کر دیئے۔ دوسرے نے ریڈیو کی سوئی گھمانی شروع کر دی۔ تیسرا بچہ بک شیلف پر چڑھ گیا۔ اور کتابیں نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ چوتھا بچہ اونچے کارنر پیس پر پڑے ہوئے گلدان کے پھولوں

کو لالچی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر ایک سٹول اُٹھا کر کارنر پیس پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا میرا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔

"کیا حال ہے؟" دولت رام نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے میری پیٹھ پر دوسرا دھپ مار

"اچھا ہوں!" میں نے کانپ کر مری ہوئی آواز میں کہا۔

اتنے میں ایک زور کا تڑاخہ ہوا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا۔ چوتھے بچے نے گلدان سے پھول گھسیٹنے کی کوشش میں پھولدان ہی کو گھسیٹ لیا تھا اور اب، پھولدان فرش پر گر کر ایک سو ایک ٹکڑوں میں بکھرا پڑا تھا۔

"یہی وہ گلدان ہے نا۔ جو آپ خورجے سے لائے تھے؟" مسٹر دولت رام نے بڑے اطمینان سے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں وہ تو پچھلے ہفتے ہی ٹوٹ چکا تھا" میں نے خوش ہو کر کہا "جب آپ اپنے سب سے چھوٹے بچے کی سالگرہ کی دعوت کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔"

"ارے وہ تو دوسرا گلدان تھا" مسز دولت رام نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"جسے ہمارے پپّو نے توڑا تھا" پھر وہ میری بیوی کی طرف مخاطب ہو کر بولی "یہ (اپنے شوہر کی طرف اشارہ کر کے) بڑے بھلکڑ ہیں۔ انہیں کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ کون گلدان کب ٹوٹا تھا۔ کون کب؟"

میری بیوی جواب میں کچھ خوفزدہ سی ہو کر منمنائی۔ اتنے میں ریڈیو گرام سے ایک بھیانک سی چیخ بلند ہوئی۔ اور میں نے دیکھا کہ دونوں لڑکے آپس میں لڑ رہے ہیں اور ریڈیو کے دونوں بٹن ریڈیو گرام سے نکل کر اُن کے ہاتھوں میں آچکے ہیں۔ بڑے لڑکے نے چھوٹے لڑکے کے گھونسہ مارا۔

"شاباش!" دولت رام خوشی سے چلّایا۔

مگر گھونسہ لڑکے پر پڑنے کے بجائے ریڈیوگرام کے کانچ پر پڑا۔ اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ اور لڑکا سہم کر ریڈیوگرام سے الگ کھڑا ہو کر بسورنے لگا۔

"ڈر گیا میرا لال!" مسز دولت رام جلدی سے اپنے بچے کو اپنے گھٹنوں

اتنے میں مَیں نے کیا دیکھا کہ تین بچّے کتابوں پر جھکے ہوئے ہیں اور م

تصویریں پھاڑ پھاڑ کر الگ کر رہے ہیں۔ بچّوں کو مطالعے کا کس قدر شوق ہو

ہی سمجھ میں آئی۔ اتنے میں دیوانِ غالب کے مصوّر ایڈیشن پر دو بچّوں کا جھگڑ

بچّے اُس کتاب کو اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے۔ کھینچنے میں آدھی کتاب ایک بچّے

گئی آدھی دوسرے بچّے کے ہاتھ میں رہ گئی۔ اور غالبؔ زبانِ حال سے کہتا

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تما

پانچواں اور چھٹا بچہ دونوں بڑے ہوشیار تھے۔ انہوں نے ڈرائنگ

اور دوڑاتے ہوئے کھانے کے کمرے میں گھس گئے تھے۔ اور وہاں سے سنگتر

تربوز کی قاشیں اُٹھا لائے تھے۔ کچھ کھا رہے تھے۔ کچھ مار رہے تھے۔ ایک

سے جا لگا۔ اور وہاں سے اُچھل کر دیوار سے لگنے والا تھا کہ دولت رام نے

میں کیچ کر لیا۔ اور میری طرف فاتحانہ انداز سے دیکھ کر بولے۔

"اب تو عادت چھوٹ گئی۔ لیکن بچپن میں کرکٹ کا بہت عمدہ کھلاڑی

اس پر میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے اپنی بیوی کا رنگ متغیّر ہوتے دیکھا اور پھر دیکھا کہ چھٹے بچّے کی نگاہیں میری بیوی کی نئی شان کی جو گیا ساڑھی پر ہیں۔ بالکل نئی اور خوبصورت ساڑھی تھی۔ جو جگہ جگہ زردوزی کے کام سے جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ غریب بچّے کا دل اُس